رُوبرو
آسیہ رئیس خان
SohniDigest.com

ناول

آسیہ رئیس خان

رُوبرو

آج پھر وہی دن تھا۔ایک قرض دار اپنے قرض خواہ سے ملنے آرہا تھا۔قرض دار بھی ایسا جو ممبئی شہر سے اپنی چمچماتی ایس یو وی، جسے ایک تنخواہ دار ڈرائیور چلاتا تھا،ٹوٹی، پھوٹی، بسورتی سڑکوں والی بھیونڈی میں قرض خواہ کے مکانِ کُہن، جس کے شانے زمانے اور موسموں کے آلام جھیل کراس کے مالک کی طرح جھک گئے تھے، کے دروازے کے سامنے ایک شانِ بے نیازی سے اترتا اور اس امیر قرض دار کے استقبال کے لیے ڈیڑھ دہائی سے ریٹائرڈ قرض خواہ بچھا بچھا جاتا تھا۔اس ملاقات میں ملوث فریقین کے بقول اس دوڑتی بھاگتی، تیز رفتار، مطلب پرست دنیا میں یہ مخلص لمحات ان کیلئے بڑے بیش قیمتی تھے۔اس حسین ترتیب ومنظر کے ایک گوشے میں منہ بناتی ہستی اس کی یعنی صفیہ اظہار الحق کی تھی۔منہ بننے کی کئی وجوہات تھیں۔اسے اپنے وی آئی پی ماموں جان کا کسی اور کو وی آئی پی ٹریٹمنٹ دینا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔دوسرے وہ دونوں باتوں میں ایسے کھو جاتے کہ گھنٹوں گزر جانے کا احساس ہوتا تھا، نہ ہی گھر میں ایک تیسرے وجود کی موجودگی کا۔

اس قرض دار کی خاطر مدارت اور اس کے آنے سے پہلے کی تیاری الگ،لیکن ان سب میں سرِفہرست وجہ اس قرض دار کی موجودگی میں اس کی حیثیت کا ثانوی ہونا تھا۔وہ اپنے ماموں جان کی آنکھوں کا بلاشرکت غیرے

تارہ تھی اور سال بھر پہلے نمودار ہوا یہ قرض داران کی آنکھوں کا چاند بن بیٹھا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے آپ کو بتا دیں کہ یہ وہ قرض تھا جس نے ایک یتیم، غریب لیکن ذہین و قابل بچے کو سائنس دان بنا دیا تھا۔ بقول قرض خواہ، انہوں نے وہی کیا تھا جو ایک استاد کو شاگرد کے لیے کرنا چاہیے۔ انہوں نے اپنے شاگرد کی تعلیمی، اخلاقی اور معاشی مدد کی تھی۔ اس کے لئے ہر دستیاب اسکالرشپ کو حاصل کرنا ممکن بنایا تھا۔ وظیفہ چاہے اقلیتی ہوتا، معاشی طور پر پسماندہ کے مختص، کسی ٹرسٹ کی طرف سے یا پھر او بی سی کیٹگری کے لیے مخصوص، ہر بار انہوں نے خود بھاگ دوڑ کر کے اسے حاصل کرنے کے لیے ضروری دستاویزات اور کاروائیاں مکمل کی تھیں۔ جہاں سفارش کی ضرورت تھی وہاں سفارش کی اور جہاں سرپرست کی ضرورت تھی وہاں سرپرست بن کر حاضر ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک اس جیسے قابل اور ہونہار طالبعلم کی طرف یہ ان کا فرض بنتا تھا جبکہ یہ قابل اور ہونہار طالبعلم عمر بھر کے لیے اس فرض کا قرض دار اور احسان مند رہنا چاہتا تھا اور اس میں پس وہ رہی تھی۔

سرکاری اسکول کے سبکدوش ٹیچر عبدالحمید بخاری کے ہونہار طالب علم ہارون انصاری نے فزکس میں ماسٹرز کرنے کے بعد پی ایچ ڈی بیرون ملک میں مکمل کی تھی۔ امریکہ کے ایک ادارے میں ریسرچ اور پھر آسٹریلیا کی یونیورسٹی میں ریسرچ اور درس و تدریس کے فرائض انجام دے کر وہ سال بھر پہلے واپس ملک لوٹا تھا۔ یہاں اسے ایک سائنسی ادارے میں کسی ریسرچ پروجیکٹ پر اپنی قابلیت اور صلاحیت کی روشنی ڈالنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ جس دن سے اسے ہارون کے عارضی قیام کی خبر ملی تھی کہ اس پروجیکٹ کی تکمیل کے بعد اسے واپس امریکہ یا آسٹریلیا لوٹنا ہے، وہ پروجیکٹ میں شامل افراد سے زیادہ شدت سے پروجیکٹ کے جلد مکمل و کامیاب ہونے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ منفی خیالات اور جذبات کے ساتھ ساتھ اس کے برتاؤ میں اخلاقی اور رسمی گرمجوشی کا فقدان یک طرفہ نہیں بلکہ باہمی تھا۔ عمر میں اس سے کئی سال بڑے اور دو بچوں کے باپ ہارون کی سمجھ سے باہر تھا کہ سر عبدالحمید کے زیر سایہ پلنے والی یہ لڑکی، ان کی شخصیت اور خوبیوں سے کیونکر استفادہ حاصل نہ کر سکی۔ ہارون کے مطابق اس میں اب تک ٹین ایجرز والی لا ابالی تھی جبکہ عبدالحمید سر کی محبت اور صحبت میں اسے پختہ سوچ اور

سنجیدہ مزاج والی شخصیت کا حامل ہونا چاہیے تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ ہارون کے یہ خیالات اسی تک محدود تھے، صوفی کو ان کی بھنک نہیں پڑی تھی ورنہ وہ ٹین ایجرز والی لاابالی کے ساتھ ساتھ اپنی اور بھی کئی ٹین ایجرز والی خصوصیات سے اسے روشناس ضرور کراتی۔

ان دونوں کا پہلا سامنا ہی انہیں ایک دوسرے سے متنفر کر گیا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ ماموں جان کا معمول تھا۔ اس دن ان کے معمول میں فرق ڈالنے اس کی نامرغوب ہستی یعنی پھوپی آدھمکی تھیں۔ پھوپی، میں، میرا اور میری کی تفسیر تھیں۔ اور اس ساری میں، میں کا نچوڑ یہ ہوتا تھا کہ اس سرزمین پر وہ واحد عورت ہے جو ماموں جان کی چہیتی بھانجی کی ساس بننے لائق ہے۔ چونکہ ماموں جان کو ان کے چہیتے بیٹے کا تاریخ جغرافیہ ازبر تھا۔ سو ہر بار کی طرح وہ متاثر ہوئے بنا، اچھے میزبان اور سامع بنے مسکرا کر، سر ہلا کر ان کی باتیں سن رہے تھے۔

وہ ایک طرف بے نیاز بنی بظاہر اپنے فون میں مگن، دل ہی دل میں دانت پیس کر ان کی میں میں کا جواب دیے جا رہی تھی۔ پھوپی کا اپنی پی آر پہ ٹھوک بجا کر الفاظ کا خرچ جاری تھا کہ ان کی بڑی بہو کا فون آ گیا اور انہوں نے ''باقی آئندہ'' سوچ کر آج کی مشق ختم کی۔ ماموں جان کو آرام کی تاکید کرتی وہ خود پھوپی کو دروازے تک رخصت کرنے آئی تھی۔ وہ آٹو میں بیٹھ کر نظر سے اوجھل ہوئیں تب تک وہ اپنے اطمینان کے لیے دروازہ پکڑے کھڑی رہی۔ کچھ بعید نہ تھا کہ ماموں جان کو قائل کرنے لائق کوئی جملہ ان کے ذہن میں کلبلاتا اور وہ واپس پلٹ آتیں۔ اسی وقت ایک چمچماتی کار دروازے کے باہر آ کر رکی اور پچھلی نشست پر بیٹھے شخص نے اس کی سمت دوستانہ مسکراہٹ اچھالی۔

''مان نہ مان میں تیرا مہمان۔'' اس نے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے ایسا منہ بنایا کہ بس زبان چڑانے کی کسر رہ گئی تھی۔ اجنبی کے اس زبردستی کے التفات کا سارا غصہ دروازے پر نکالتے ہوئے اس نے زوردار آواز کے ساتھ اسے بند کیا۔ اس نے ابھی صحن عبور بھی نہیں کیا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے واپس آ کر ذرا سا دروازہ کھولا اور سامنے اسی ''مان نہ مان میں تیرا مہمان'' کو دیکھ کر با آواز بلند کہا تھا۔

''یعنی حد ہے۔''

''جی یہ'' مقابل نے ہاتھ میں پکڑی چٹ سامنے کرتے ہوئے آغاز کیا ہی تھا کہ وہ بیچ میں بول اٹھی۔

''ایسا ہے کہ ہم بہت ہی آدم بےزار اور بداخلاق ہیں، ہمارے آگے پیچھے، دائیں بائیں، کون پڑوسی رہتا ہے ہم نہیں جانتے، بہتر ہے آپ کسی اور کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔'' اس نے ایک بار پھر دھاڑ سے دروازہ بند کیا۔

ابھی صحن کے درمیان میں ہی تھی کہ کسی اور کا نہیں اسی کا دروازہ دوبارہ کھٹکھٹایا گیا۔ کھٹ کھٹ کا انداز مہذبانہ ہرگز نہ تھا۔

''واہ کیا ڈھیٹ ہے۔'' اب کے دروازے کے پار کھڑے بندے کی طبیعت صاف کرنے کے ارادے سے اس نے پورے پٹ وا کیے۔ ابھی کمر پر ہاتھ رکھے ہی تھے کہ وہ شروع ہو گیا۔

''اپنی خامیوں کا یوں دروازے پر اعتراف قابل تعریف ہے، لیکن یہ زبان خود اپنی بداخلاقی کا اعلان کرنے والے کے لیے لکھنوی تہذیب کی یاد دلاتا ''ہم'' کا صیغہ اس تہذیب کی توہین ہے۔''

عمر کے چھبیسویں سال میں صفیہ بی بی نے پہلی بار ''سر پہ لگی تو تلوؤں میں بجھی'' کے معنی تجربے سے سمجھے۔

''صوفی۔'' پیچھے سے ماموں جان کی آواز آئی۔ وہ دستک اور پھر باتوں کی آوازیں سن کر باہر آئے تھے۔

''کیا ہوا؟ کون ہے؟'' انہوں نے ہال کی دہلیز پر کھڑے پوچھا۔

''السلام علیکم سر۔'' اس نے گردن اونچی کر کے بلند آواز میں سلام کیا۔ ''میں ہوں ہارون انصاری۔''

''ارے......'' ماموں جان کی خوشی سے لبریز آواز پر اسے جھٹکا لگا کہ فرط جذبات سے آواز کی یہ کھنک اس کے لیے مخصوص تھی۔

''ہارون۔'' دہلیز سے باہر قدم رکھ کر وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے۔ وہ ایک سیڑھی چڑھ کر اوپر آیا تو صوفی کو دروازے کے وسط سے ہٹنا پڑا۔ پلک جھپکتے ہی ہارون صحن میں ماموں جان سے بغل گیر ہو رہا تھا اور بس یہی سے اس کی ''داستان الم'' کا آغاز ہوا۔

صوفی نے اس کے بعد متعدد بار سوچا کہ کاش! اسے پہلے سے اندازہ ہوتا اس ''جگری استادی شاگردی'' کا تو وہ ہارون کے ہاتھ سے چٹ لے کر اسے ایسا ایڈریس سمجھاتی کہ وہ کبھی اصل عبدالحمید بخاری سر کا گھر نہ ڈھونڈ پاتا۔ اس پہلی آمد کے بعد سے وہ تقریباً ہر ہفتے آنے لگا تھا اور بقول ماموں جان اتنی دور آنے کی یہ تکلیف وہ صرف ان کی تنہائی کے خیال سے اٹھاتا تھا۔ اس درمیان میں اس کے دونوں بچے گیارہ سالہ حمود اور چھ سالہ ہنز

بھی کئی باراس کے ساتھ آئے تھے۔صوفی کا خیال تھا کہ باپ کے برعکس بچے بڑے مہذب اور عمر کے اعتبار سے کافی سلجھے ہوئے تھے۔خاص طور پر حمود۔اس کا سارا کریڈٹ وہ بچوں کی مرحومہ ماں کو دیتی تھی۔صوفی کے مطابق یہ اسی کے جین تھے یا پھر اس کی تربیت۔ابتدائی تعارف کے بعد بچوں نے ماموں جان کو دادا جان بنالیا تھا اور جب حمود نے ماموں جان کی طرح صوفی کو صوفی ہی بلایا تو ہنر نے انگریزی میں ٹوکا تھا۔

''بھائی!بڑے لوگوں کو نام سے بلانا بیڈ مینرز ہوتا ہے۔''

''دوست کو نام سے بلاسکتے ہیں،صوفی آپ میری دوست ہیں نا؟''

''ہاں۔''اب وہ کیا انکار کرتی۔

''اتنے بڑے فرینڈ!''ہنر نے آنکھیں پھیلائی تھیں۔

''عمر دیکھ کر فرینڈز نہیں بنائے جاتے۔''حمود نے اپنی غیر ملکی لہجے والی انگریزی میں کہا تھا۔اسے بڑا اچھا لگتا تھا جب وہ دونوں بہن بھائی اس لہجے میں انگریزی بولتے۔

''صوفی بڑی ہیں تو کیا ہوا،میں نے انہیں اپنا فرینڈ بنایا ہے۔''حمود نے باقاعدہ اعلان کیا تھا۔اس وقت اس بچے کی دور اندیشی کا کسی کو اندازہ نہیں تھا۔تعلق بدلنے کے باوجود بھی ان کا رشتہ آخر تک دوستی کا ہی رہا۔بھائی کو بیڈ مینرز کی یاددہانی کرانے والی ہنر نے بھی آخر بھائی کی طرح اسے صوفی کہنا ہی پسند کیا تھا۔

جارحانہ کٹ کٹ کی آواز اور اس کے سختی سے سلے لب اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ کھیرے پر چھری چلاتے ہوئے وہ کسی اور تصور کے زیر اثر ہے۔اس آواز کی وجہ سے ماموں جان زیادہ دیر تک اخبار پہ توجہ مرکوز نہ رکھ سکے۔انہوں نے اپنی عینک کے اوپر سے کچن میں دیکھا،ہال میں کھلنے والے دروازے کی سمت اس کی پیٹھ تھی۔انہوں نے عینک اتاری،اخبار میز پر رکھا اور باورچی خانے میں آگئے۔

''لاؤ میں کاٹ لیتا ہوں۔''انہوں نے اس کے ہاتھ سے چاقو لیتے ہوئے کہا تو وہ چونکی۔

''کیا؟نہیں۔آپ یہاں کیوں آگئے؟''اس نے اپنا چاقو والا ہاتھ ان کی پہنچ سے دور کیا۔''ہال میں بیٹھیں،میرا کام بھی ہوگیا ہے،ادھر ہی آرہی ہوں۔''اب کے اس نے کھیرے پر چھری چلائی تو وہ جارحیت مفقود تھی۔

"بیٹا، وہ تو نہیں کہتا ہے مگر مجھے اچھا نہیں لگتا کہ اسے کھانا کھلائے بغیر جانے دوں، بیچارا نوکروں کے ہاتھ کا بنا کھانا کھاتا ہے، کبھی کبھی گھر کا مل جائے تو اچھا ہی ہے۔"

"ہاں تو میں کہاں کچھ کہہ رہی ہوں۔" وہ منمنائی۔ آج غفلت میں پکڑی گئی تھی۔

"اسے تو دال چاول، سبزی جیسا سادہ کھانا پسند ہے، تم وہی بنایا کرو یوں ہلکان مت ہوا کرو۔" انہوں نے چولہے پر چڑھے برتنوں کی طرف اشارہ کیا۔ جن میں انواع واقسام کے پکوان تیار تھے۔

"وہ ہمارے مہمان ہیں ماموں جان اور مہمانوں کو دال سبزی نہیں کھلاتے۔" سارا بکھیڑا ہی یہ تھا۔ ماموں جان مسکرا دیے۔

"وہ مہمان نہیں بیٹا گھر کا بچہ ہے۔" وہ بھی اچھی طرح جانتے تھے اصل جھگڑا کیا ہے۔

"ایک تو وہ بچہ کہیں سے نہیں ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا چاقو اٹھا کر تنبیہی انداز میں کہا۔ "دوسرے، چند دنوں کے لیے آئیں لوگ مہمان ہی ہوتے ہیں، اگر ہادی بھائی بھی چند دنوں کے لئے آئیں تو وہ گھر کا بچہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے مہمان ہی رہیں گے، جن کے لئے میں ایسا ہی اہتمام کروں گی۔" اس نے چاقو سے ان برتنوں کی طرف اشارہ کیا جہاں ذرا دیر پہلے انہوں نے کیا تھا۔

"تم نے اول دن سے ہی اس کے ساتھ بیر باندھ لیا ہے۔" وہ وہیں اسٹول پر بیٹھ گئے۔ وہ آج کل زیادہ دیر کھڑے نہیں رہ پاتے تھے۔

"میں نے کوئی بیر نہیں باندھا ہے۔" اس نے منہ پھلا کر کہا۔

"ہارون نے دشوار حالات میں بڑی ثابت قدمی سے اپنا مقصد حاصل کیا ہے۔ اس کی جماعت میں اپنی پہلی کلاس لیتے ہوئے میں نے سارے بچوں سے سوال کیا تھا کہ وہ بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں۔ ہارون نے جواب دیا تھا کہ اسے سائنس داں بننا ہے، اس وقت باقی بچوں نے اس کا مذاق اڑایا تھا اور آج دیکھ لو، وہ واحد لڑکا ہے جس نے اپنا اس دن کا کہا خواب پورا کیا ہے۔" ان کے لہجے میں فخر در آیا تھا۔

"اتنی بلندی پر پہنچنے کے بعد بھی وہ اپنی بنیادوں سے جڑا رہنا چاہتا ہے، بچوں کو اپنے شہر، اپنے محلے اور اپنے غربت بھرے ماضی سے متعارف کرانے کی کوشش کر رہا ہے، تم بھی اس کے واسطے اپنا دل بڑا رکھو بیٹا۔"

''ان کے لیے دل بڑا رکھ کر مجھے کیا کرنا ہے، ویسے بھی ماموں جان وہ دنیا کے واحد قابل اور باصلاحیت انسان تو نہیں ہیں لیکن ہاں دنیا کے لکی ترین انسان ضرور ہیں ورنہ ان سے زیادہ قابل لوگ در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں کیونکہ وہ ہارون انصاری اتنے خوش نصیب نہیں۔ مجھے ان سے کوئی پرخاش نہیں ہے۔(سراسر جھوٹ) ان کی مہمان نوازی کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ آپ کے معزز مہمان ہیں بس اور باقی......'' اس نے کچھ سوچ کر بات بدلی۔

''دراصل ان کو پسند کرنے کے لیے بھی بندے کا آئی کیو لیول ان کے اتنا اونچا مطلب زیادہ ہونا چاہیے جیسا کہ آپ کا، اب میں کہاں اتنی ذہین و فطین ہوں، میرا آئی کیو لیول تو بہت ہی لو......'' وہ بولتے ہوئے پلٹی اور وہیں اس کی زبان رک گئی۔ کچن کے صحن میں کھلنے والے دروازے میں وہ دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا، جانے کب سے۔ دفعتاً لگی بریک پر ماموں جان نے بھی پلٹ کر دیکھا۔

''السلام علیکم۔'' ہارون نے کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' وہ اسٹول سے اٹھ گئے۔ صوفی کی حیران اور سوال کرتی نظر پر ماموں جان نے وضاحت ضروری سمجھی۔

''میں نے دروازے کی کنڈی کھول دی تھی۔'' انہوں نے اس کے یوں چپ چاپ آنے کی وجہ بیان کی۔

''یعنی حد ہے۔'' اس نے ہارون کی طرف پشت کر لی۔ ''کیوں اپنے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار ان کے سامنے ہی ہوتا ہے مجھ سے کیوں؟ کیوں؟'' اس نے پھر بڑی بے دردی سے چھری چلائی تھی۔

ذرا دیر میں ہی ہال سے ان کی خوش گپیوں کی آوازیں آنے لگیں اور وہ ادھر حسب معمول کڑھنے لگی تھی۔ یہ تقریباً ہر ہفتے کی کہانی تھی۔

۞......۞......۞

اس کی پیدائش کے دو سال بعد دوسرے بچے کی ڈلیوری کے دوران اس کی امی اور دوسری بچی دونوں چل بسی تھیں۔ کچھ ماہ بعد ابو نے دوسری شادی کر لی۔ دوسری امی اچھی خاتون تھیں۔ ابو بھی اس کی طرف سے غافل نہ تھے۔ اس کے بعد دو بھائیوں کے اضافے نے اس کی اہمیت اور بڑھا دی تھی۔ وہ تیرہ سال کی تھی جب ابو بھی

دارفانی سے کوچ کر گئے۔اس کے بعد ماموں جان اسے اپنے ساتھ گھر لے آئے تھے۔انہیں سگے والدین کی غیر موجودگی میں اس کا وہاں رہنا مناسب نہیں لگا تھا۔

یہ دو سانحے جھیلنے کے بعد بھی اس نے ماموں جان اور ممانی جان کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گزاری تھی۔ تین سال پہلے ممانی جان بھی ہارٹ اٹیک کے آگے اپنی زندگی ہار گئی تھیں۔اس کے بعد ایم بی اے مکمل کرتے ہی ہادی بیرون ملک چلا گیا۔ویسے بھی وہ جونیئر کالج کے بعد سے ہی ہوسٹل میں رہتا تھا۔روزانہ بھیونڈی سے ممبئی کالج آنا جانا آسان نہ تھا۔ہادی نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا لیکن اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے والدین سے اس بات پر نالاں رہتا ہے کہ اکلوتی اولاد سے زیادہ انہیں صفیہ کی فکر رہتی ہے۔اسی لئے جب اس نے ممانی جان کو ہادی کے کان پر یہ بات ڈالتے سنا کہ وہ اور ماموں جان چاہتے ہیں کہ صفیہ ہمیشہ اسی گھر میں رہے اور یہ بات اسے بھی ذہن میں رکھنی چاہیے، تب اسے کوئی گدگدی نہیں ہوئی تھی۔اسے علم تھا کہ ہادی ایسا کبھی نہیں چاہے گا۔

ہادی کے بظاہر معمولی برتاؤ کے پیچھے چھپی سرد مہری اسے خوب محسوس ہوتی تھی۔اور وہی ہوا بھی۔ممانی کے انتقال کے بعد سے دبئی گیا ہادی صرف دو بار انڈیا آیا تھا اور پھر ڈیڑھ سال پہلے اس نے وہیں شادی کر لی تھی۔ تب سے ماموں جان کے ساتھ اس کے بظاہر عام باپ بیٹے والے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔شادی میں شرکت کے لیے اس نے ان دونوں کی ٹکٹیں بھیجی تھیں۔ان دنوں اس کے امتحان چل رہے تھے۔اس نے لاکھ کہا کہ وہ آئندہ سمسٹر میں پیپرز دے لے گی لیکن ماموں جان تیار نہیں ہوئے۔انہیں دکھ تھا کہ اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے اجازت لینا تو دور، اس نے ذکر تک نہیں کیا تھا، سیدھے اطلاع دینے فون کیا تھا۔ہادی کی اس لاتعلقی نے ماموں جان کو بہت تکلیف پہنچائی تھی۔وہ اس کی طرف سے بہت مایوس ہوئے تھے۔ہادی اب بھی ہر ماہ ان کے لئے مخصوص رقم بھیجتا اور مہینے میں کم سے کم ایک بار فون کر کے ان کا حال احوال ضرور پوچھتا تھا لیکن اس کا یہ رسمی رویہ ماموں جان کو کوئی خوشی نہیں دیتا تھا۔

وہ صوفی کی طرف سے بے فکر تھے کہ ہادی کے آنے کے بعد ان دونوں کی شادی کرنا تھی لیکن ہادی کے وہاں شادی کر لینے کے بعد سے ماموں جان اس کی شادی کے لیے کوشاں تھے۔انہیں ابھی تک صوفی کے لائق کوئی لڑکا نہیں ملا تھا۔اس دوران تایا ابو اپنے بیٹے احمد اور اس کے لیے انکار کے بعد پھوپی کی طرف سے ان کے

سیف کا رشتہ لے کر آئے تھے۔اور بھی وجوہات تھیں لیکن ان دونوں امیدوار کی واجبی سی تعلیم سب سے بڑی وجہ تھی کہ ماموں جان نے انکار کر دیا تھا۔اشمد گیارہویں بھی پاس نہیں کر پایا تھا جبکہ سیف نے جونیئر کالج گرتے پڑتے مکمل کر لیا تھا۔

وہ دونوں ہی اسکول کے زمانے سے اپنے اباؤں کے کام میں ہاتھ بٹا رہے تھے۔انہیں بچپن سے علم تھا آگے یہی کرنا ہے پھر کیوں پڑھائی میں دماغ صرف کرتے۔تایا کا ہوٹل تھا اور پھوپا کی گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس کی دکانیں۔دوسرے سیف کے کارناموں کی ماموں جان کو اڑتی اڑتی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ساری ساری رات گھر سے باہر رہنا، سڑکوں پر تیز رفتار گاڑیاں دوڑانا، ذرا ذرا سی باتوں پر جھگڑا کرنا اور معمولی سی بات پر بھی ہاتھا پائی پر اتر آنا۔ان کے نزدیک ان عادتوں کا حامل بندہ کسی بھی طرح صوفی کے لائق نہیں تھا۔انکار کے بعد بھی پھوپی نے ابھی تک ہار نہیں مانی تھی۔

اسی سال اس کی امی نے تئیس سال کی عمر میں ہی اپنی بہن کی بیٹی سے صفوان کی شادی کر دی تھی۔اس شادی کے بعد سے اس کی شادی کے لیے ہر سمت سے ماموں جان پر پڑنے والا دباؤ اسے بھی محسوس ہونے لگا تھا۔خاندان کی تقاریب میں اب لوگ برملا اظہار کرنے لگے تھے کہ اس کی عمر ہونے آئی ہے اور نہ جانے ماموں جان کے کیا ارادے ہیں۔

ماموں جان نے جب اس کی اچھی سی تصویر مانگی تو اسے لگا تھا کہ اپنے کسی دوست یا جاننے والے کو دینا چاہتے ہونگے، لیکن اس وقت اسے ان کا مقصد جان کر ذرا سا غصہ آیا تھا جس دن ہارون کے ساتھ کوئی اور بھی تشریف لایا۔

اس دن ماموں جان نے اسے ہارون کے لئے کھانا بنانے سے منع کیا تھا۔ان کے آنے کے کچھ دیر بعد وہ مہمان کے لئے "چائے پانی" لے کر ہال میں آئی اور تیسرے شخص کو دیکھ کر چونک گئی۔خلاف معمول ماموں جان نے اسے وہاں بیٹھنے کو کہا اور اس شخص سے اس کا تعارف کروایا تب اس کے اندر گھنٹی بجی اور جانے کیوں اس نے ہارون کو گھورا تھا۔

"یعنی حد ہے۔" وہ دل ہی دل میں کسمسائی تھی۔

کچھ دنوں بعد پھر یہی دہرایا گیا، تب اسے ماموں جان کی اپنے لئے فکر کی شدت کا اندازہ ہوا تھا۔ وہ ماموں جان کے ہارون پر اعتماد سے واقف تھی پھر بھی اسے اس معاملے میں ہارون کا شامل کیا جانا اچھا نہیں لگا تھا۔اس کے باوجود بھی وہ ماموں جان کی فکر ختم ہونے کی دعائیں کرنے لگی تھی۔

⚝......⚝......⚝

وہ ماموں جان کے ساتھ ابھی دواخانے سے لوٹی تھی۔کل سے ان کے پیٹ میں درد تھا۔ڈاکٹر نے ہائپر ایسیڈیٹی تشخیص کر کے دوائیاں دی تھیں۔وہ ماموں جان کو دوائی دے رہی تھی کہ پھوپی آ دھمکیں۔

"کیا ہوا بھائی صاحب؟ کون سی دوائیاں لے رہے ہیں؟" انہوں نے ٹیبل پر رکھے دوا کے ڈبے کو دیکھ کر پوچھا۔"آپ کو تو ماشاء اللہ ہائی بلڈ پریشر ہے نہ ڈائبیٹیز۔"

"پیٹ گڑبڑ کر رہا ہے، ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تیزابیت بڑھ گئی ہے۔"

"ہاں، عمر کے ساتھ تو یہ سب لگا ہی رہتا ہے۔اب مجھے ہی دیکھیں، آپ سے چھوٹی ہوں لیکن بلڈ پریشر ہے، تھائیرائیڈ ہے اور گھٹنوں کا درد الگ، اس پر شوگر کا ڈر بھی لگا رہتا ہے۔"

"یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ اس نے اب تک بڑی بیماریوں سے محفوظ رکھا ہے۔"

"اسی لئے تو کہتی ہوں، صحت ہے تب تک اپنی آنکھوں کے سامنے بھانجی کو اس کے گھر کا کر دیں، ورنہ کل کا کیا بھروسہ، آج کل تو چلتے پھرتے، ہٹے کٹے صحت مند بھی بس ذرا سے بہانے سے موت کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔"

"پھوپی......" اس نے دہل کر انہیں ٹوکا۔

"غلط تو نہیں کہا بھائی صاحب، آپ ہی بتائیں؟ ابھی دو دن پہلے ہی......"

"پلیز پھوپی۔" اب کے اس نے حتمی انداز میں کہا۔

"آج آپ مجھے صاف صاف بتا ہی دیں، کیا کمی ہے میرے سیف میں؟"

"طاہرہ بی بی، شادی جوڑ کی ہونی چاہیے۔صوفی انگلش ادب میں ایم اے ہے اور آپ کا سیف صرف بارہویں پاس۔" ماموں جان نے پہلی بار ٹال مٹول کی جگہ دوٹوک بات کی تھی۔

http://sohnidigest.com

"اس سے کیا ہوتا ہے، بارہویں پاس ہے پھر بھی آپ کی انگریزی میں ایم اے پاس سے کہیں زیادہ کماتا ہے۔ اپنا گھر ہے، دیکھنے میں خوبرو ہے، پھر میں خود صفیہ کو بہو بنانے کے لئے آپ کے پاس سوالی بن کر آئی ہوں۔" پھوپو کی لسٹ تیار تھی۔

"صوفی اور سیف کے مزاج میل نہیں کھاتے ہیں۔" وہ صاف صاف نہیں کہہ سکتے تھے کہ آپ کا بیٹا میرے نزدیک آوارہ مزاج ہے۔ "اور جو باتیں آج آپ کو سرے سے کوئی مسئلہ نہیں لگتی ہیں کل وہی جھگڑوں اور اختلافات کی وجہ بن جائیں گی۔"

"بھائی صاحب! صفیہ ہمارا بھی خون ہے۔" انہیں ماموں جان کی بات بری لگی تھی سو ناگواری سے گویا ہوئیں۔ "ہمارے بھائی کی نشانی ہے، ہمیں بھی اس کی فکر اور پرواہ ہے، اس سے محبت ہے، ہم کیوں جھگڑا کریں گے اس سے؟"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ کو اس سے......"

"اور کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ آپ نے ہمیشہ اسے ہم سے دور رکھا، ہم اب تک خاموش رہے ہیں۔ آپ اسے ستائیس سال کی عمر میں بھی گھر میں بٹھائے رکھنے کو تیار ہیں لیکن اس کے اپنوں میں بیاہیں گے نہیں۔"

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی ماموں جان بول اٹھے۔

"میں نے آپ سب کو صوفی سے ملنے یا اس کیلئے کچھ کرنے سے کبھی نہیں روکا۔ رہا شادی کا معاملہ، تو یہ سب نصیب کی باتیں ہیں، مناسب وقت پر یہ بھی ہو جائے گی۔"

"واہ! ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور پھر نصیب کو دوش دیں۔" پھوپی کا انداز تضحیک وطنز لیے تھا۔

"خدا گواہ ہے، میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا ہوں۔" ماموں جان نے تھکے انداز میں کہا تو اس نے ضبط کو لات ماری۔

"پھوپی! سب سے پہلے تو یہ کہ میں ستائیس سال کی نہیں چھبیس کی ہوں، دوسرا یہ کہ میرے تعلق سے ہر فیصلے کا اختیار صرف ماموں جان کو ہے اور تیسرا......"

"صوفی!" ماموں جان کی تنبیہی پکار پر اس کا جملہ حلق میں رہ گیا جو تھا کہ آپ کے سیف کے لئے میں خود

انکار کرتی ہوں۔

”بڑوں سے یوں بدتمیزی نہیں کرتے۔“

”ہاں۔“ پھوپی کھڑی ہوگئیں۔ ”دیکھ لی آپ کی تربیت، اپنے خون سے زبان درازی کر رہی ہے، چلتی ہوں، آپ ہفتہ دس دن میں اس کے لیے کوئی فیصلہ کرلیں ورنہ پھر ہم ہیں، لڑکی کو یوں گھر بیٹھ کر بوڑھی نہیں ہونے دیں گے۔“ وہ اٹھ کر صحن میں جانے لگیں۔

ماموں جان کے اشارے پر چار و ناچار وہ بھی خدا حافظ کہنے کے لئے ان کے پیچھے صحن میں آئی لیکن آج پھوپی الوداعی کلمات کے موڈ میں نہیں تھیں۔ وہ اسے دیکھے بغیر ہی باہر نکل گئیں۔

”ذرا میرا فون تو دینا۔“ وہ واپس ہال میں آئی تو ماموں جان نے کہا۔ صوفی نے انہیں فون دیا۔ انہوں نے نمبر ملا کر فون کان سے لگایا۔ ذرا دیر بعد کمرے میں پھیلی وزن دار خاموشی میں ماموں جان کی آواز ابھری۔

”ہیلو، ہارون۔ وعلیکم السلام۔“ اسے علم تھا اب کیا بات ہوگی۔ وہ ہال سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کے بعد ہارون کے آنے تک ان دونوں کی اس بارے میں کئی بار فون پر گفتگو ہوتی رہی تھی۔

✿......✿......✿

ہارون پھر کسی نئے امیدوار کے ساتھ حاضر تھا۔ آج ماموں جان نے اس کی آمد کی پیشگی اطلاع نہیں دی تھی جس کا مطلب تھا وہ کھانا نہیں کھائے گا۔ ان دونوں کی آمد کے وقت وہ دوائیاں نکال رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ سلام وجواب کے بعد اس نے ماموں جان سے دریافت کیا۔

”ذرا ایسیڈیٹی بڑھ گئی ہے اور کچھ بدہضمی بھی رہنے لگی ہے۔“

”یہ ’ذرا ایسیڈیٹی‘ اور ’کچھ بدہضمی‘ ساری رات ماموں جان کو سونے نہیں دیتی ہے۔“ پہلی بار اس نے ہارون کو سیدھے اور سنجیدگی سے مخاطب کیا تھا۔ ”پیٹ میں درد بھی رہتا ہے، ڈاکٹر نے سونوگرافی تجویز کی ہے لیکن ماموں جان مسلسل ٹال رہے ہیں۔“ اس نے دوائی اور پانی کا گلاس ماموں جان کو تھماتے ہوئے کہا۔

”کیوں سر؟“

”یہ سب چھوڑو، ان برخوردار کا تعارف تو کرواؤ۔“ انہوں نے دوائی نگلنے کے بعد ہارون کیساتھ آئے

بندے کی سمت اشارہ کیا۔

''یہ تنویر عثمانی ہے، کالج میں لیکچرر ہے اور جاب کے ساتھ پی ایچ ڈی کی تیاری بھی چل رہی ہے۔ آپ کو پروفیسر قدوسی تو یاد ہے ناں، انہوں نے ہی پہلی بار تعارف کروایا تھا تاکہ میں تھیسس کے سلسلے میں تنویر کی مدد کر سکوں۔'' وہ اس کا تفصیلی تعارف کرانے لگا اور اس نے ہارون کو گھورا تھا۔

''یعنی حد ہے، بس اتنی ہی فکر ہے اپنے سر کی۔''

''بہت خوب! کہاں سے ہیں آپ؟''

''آبائی وطن تو الہ آباد ہے، میری پیدائش اور ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی ہے۔ بیس بائیس سال قبل والدین ممبئی منتقل ہو گئے تھے، تب سے یہیں سکونت پذیر ہیں۔'' تنویر نے سعادت مند بچوں کی طرح جواب دیا۔

''یہ میری بھانجی ہے صفیہ۔'' انہوں نے اسے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دیوان پر ان کے بازو میں بیٹھ گئی۔

''السلام علیکم۔'' صفیہ کو اس وقت سلام ہی سوجھا۔

ماموں جان کے ساتھ انٹرویو نما رسمی سوال و جواب کے دوران تنویر کی تفصیلی جائزہ لیتی نظریں اسے خوب محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر بعد ان کے درمیان سے اٹھ کر باورچی خانے میں آ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد وہ دونوں جانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ ہارون نے ماموں جان کو دروازہ تک آنے سے روک دیا تھا۔ ان دونوں کے صحن میں جاتے ہی وہ ان کے سر پر آن کھڑی ہوئی۔

''ابھی چلیں، میں نے فون پر اپائنٹمنٹ لے لیا ہے۔'' وہ انہیں سونوگرافی کے لیے چلنے کو کہہ رہی تھی جبکہ ان کا قطعی ارادہ نہ تھا۔

''پہلے مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔'' انہوں نے لیٹنے کے لئے تکیہ درست کیا۔ ''ابھی ذرا دیر سونے دو، کل صبح چلیں گے۔''

''ماموں جان!'' اس نے بازو پکڑ کر انہیں لیٹنے سے باز رکھا۔ ''کیوں سن نہیں رہے ہیں آپ؟ صرف آدھے گھنٹے کی بات ہے۔''

''ایسیڈیٹی اور بدہضمی کے لیے کیا سونوگرافی تمہاری تکرار پر ڈاکٹر نے لکھ دیا ہے، اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

”پڑھائی میں استاد کی سنتے ہیں اور بیماری میں ڈاکٹر کی۔“ اس نے اپنی منطق جھاڑی۔ ”ہر جگہ اپنی نہیں چلاتے۔“

تبھی صحن کا باہری دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور چند لمحوں بعد ہارون اندر آیا۔ وہ تنویر کو روانہ کر کے خود رک گیا تھا۔

”چلیں۔“ اس نے آتے ہی ماموں جان سے کہا۔ ”آپ کے ٹیسٹ اور کمپلیٹ چیک اپ کرواتے ہیں۔“

ماموں جان نے ذرا بے بسی سے ہارون کو دیکھا، نہ انکار نہ احتجاج۔ انہیں پل بھر میں یوں نیم رضامند دیکھ کر اسے ایک بار پھر ہارون پر غصہ آ گیا۔ اس کے اصرار پر بھی تیار نہیں تھے اور ہارون کے ایک بار کہنے پر ہی مان گئے۔

”میں نے سونو گرافی کا اپوائنٹمنٹ لے لیا ہے۔“ یہ وقت غصہ دکھانے کا نہیں تھا۔ اس نے فوراً ٹیبل کی دراز کھول کر ماموں جان کی فائل نکال کر ہارون کو تھمائی۔ ”یہ ماموں جان کی فائل۔“ پھر ماموں جان کا کوٹ لا کر انہیں دیا جو وہ گھر سے باہر نکلتے وقت کرتے شلوار پر پہنتے تھے۔

”تم دونوں ہی ضدی ہو۔“ صوفی کے ہاتھوں سے کوٹ لیتے ہوئے انہوں نے کہا۔

وہ انہیں باہر تک چھوڑنے آئی۔ ہارون آج ڈرائیور کے بغیر آیا تھا۔ ان کے لیے دروازہ کھولنے اور ان کے بیٹھنے کے بعد اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

”خدا حافظ۔“ اس نے ہاتھ ہلا کر ماموں جان سے کہا۔ وہ جواب دیتے اس سے پہلے ہی ہارون نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”یعنی حد ہے۔“ اسے یقین تھا ہارون نے جان بوجھ کر کیا ہے۔

کئی گھنٹوں بعد جب دونوں لوٹے تو تھکن سے چور تھے۔

”آج یہیں رک جاؤ، ویسے بھی کل چھٹی ہے۔“ انہیں چھوڑ کر ہارون جانے لگا تو ماموں جان نے کہا۔

”نہیں سر، گھر پر بچے انتظار کرتے ہیں، مجھے بھی چھٹی کا ایک ہی دن تو ملتا ہے ان کے ساتھ۔“

وہ جب بھی بچوں کو لے کر آیا اتوار کے دن آیا تھا جبکہ خود ہمیشہ سنیچر کو ہی آتا تھا۔

”پھر تو تمہیں نہیں روک سکتا، جاؤ۔“

''پہلے کھانا کھالیں۔'' صوفی نے کچن کے دروازے سے جھانک کر کہا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو ان دونوں کا ردعمل مختلف ہوتا تھا، کم از کم حیرت کا اظہار تو کرتے ہی تھے لیکن اس وقت وہ دونوں بس سر ہلا کر رہ گئے۔

صوفی نے ہال میں ہی دستر خوان لگایا۔ آج اس نے 'سائیڈ ڈشس' کے ساتھ دال چاول اور سبزی روٹی ہی بنائی تھی کیونکہ اہتمام کی تیاری نہیں تھی۔ رات کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا اور کھانا کھلائے بغیر جانے دینا مہمان نوازی کے اصول کے خلاف تھا۔

''کیا کہا ڈاکٹر نے؟ سونوگرافی اور باقی رپورٹس مل گئیں؟'' وہ ان کیساتھ دستر خوان پر بیٹھ گئی تھی لیکن کھانا نہیں کھا رہی تھی۔

''سب ٹھیک ہے۔'' ماموں جان نے جواب دیا۔

''الحمدللہ۔''

''تم کھانا کیوں نہیں کھا رہی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''بعد میں کھالوں گی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ تبھی ہارون نے خالی پلیٹ اس کے آگے رکھی پھر دال کا پیالہ اٹھا کر پلیٹ کے قریب رکھا۔ صوفی نے سر اٹھا کر دیکھا تو ہارون نے سر کے اشارے سے اسے کھانا شروع کرنے کو کہا۔

''گرگٹ۔'' اسے دوپہر والی حرکت یاد آ گئی۔ ''منہ سے بولنے میں تو جیسے ڈکٹریٹ پر حرف آتا ہے۔'' اس نے دل میں سوچا اور چپ چاپ پلیٹ میں دال چاول نکال کر کھانے لگی۔

کھانے کے بعد چائے پی کر اسے دوائیاں وقت پر دینے کی ہدایتیں کرتا جیسے وہ اسے کڑھنے کیلئے پیچھے چھوڑ گیا تھا۔

''ان کی آمد سے پہلے تو جیسے کوئی ماموں جان کا خیال ہی نہیں رکھتا تھا۔''

اگلا دن اتوار تھا اور ماموں جان صبح سے ہی اپنی فائلوں والی الماری کھول کر بیٹھے تھے۔ وہ فائلوں سے کاغذات چھانٹ چھانٹ کر الگ کر رہے تھے۔ ان کا دن اسی میں تمام ہو گیا تھا۔ کھانا اور چائے بھی وہیں پہلے

کاغذوں کے بیچ ہوا تھا۔اس دوران انہوں نے ہارون کے علاوہ اپنے وکیل دوست کو فون لگا کر لمبی بات کی تھی۔

رات میں سونے سے پہلے انہوں نے اسے اپنے پاس بلایا۔

"تنویر کیسا لگا تمہیں؟"

"آں......ٹھیک ہے۔"

"وہ ایک دو دن میں اپنے والدین کو لے کر آئے گا۔"

صوفی نے کچھ نہیں کہا۔

"انہوں نے تصویر دیکھ کر تمہیں پسند کرلیا ہے،اگر بالمشافہ ملاقات کے بعد ان کی جانب سے مثبت اشارہ ملا تو میں فوراً تمہارا نکاح کردوں گا،تم ذہن بنالو اور تیاریاں شروع کردو۔"

"اتنی جلدی کیوں؟"

"بھول گئی،تمہاری پھوپی ایک ہفتے کا وقت دے کر گئی ہیں۔"

"آپ کہاں ان کی بات کو سیریسلی لے رہے ہیں،جانتے تو ہیں ان کا مزاج۔"

"وہ غلط تو نہ تھیں،واقعی بہت دیر ہوگئی ہے۔"

"کچھ دیر نہیں ہوئی ہے اور پھر آپ کا کیا؟"حقیقت تو یہ تھی کہ وہ خود بھی چاہتی تھی کہ کہیں بھوںڈی میں ہی اس کا انتظام ہوجائے تاکہ وہ ماموں جان کے قریب ہی رہے۔لیکن اب یہ تنویر......

"میرا انتظام ہوگیا ہے بیٹا۔"انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

فون کی رنگ پر اسکا کب،کیسے،کہاں سب زبان پر آتے آتے رہ گیا۔فون ہارون کا تھا۔اس کا منہ بن گیا۔

"ذرا اچھی سی چائے تو پلانا۔"فون اٹھانے سے پہلے انہوں نے اسے وہاں سے اٹھایا تھا لیکن وہ سمجھے بنا ہی 'ابھی لائی' کہہ کر کچن میں آگئی۔

اگلا دن ہفتے کا پہلا دن تھا اور خلاف معمول ہارون پھر حاضر تھا۔ماموں جان اس کے ساتھ مزید کچھ ٹیسٹ کروانے جارہے تھے۔

"آپ نے تو کہا تھا سب ٹھیک ہے پھر اب کون سے ٹیسٹ اور کیوں؟"

”تمہیں ڈاکٹروں کا تو پتا ہے، ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا چلتا ہی رہتا ہے۔“ اپنے ڈاکٹر کی ساری پرانی فائلیں پلاسٹک کی تھیلی میں ڈالتے ہوئے ماموں جان کہہ رہے تھے اور پہلی بار اس نے پرسوں سے اب تک ان دونوں کے چہرے پر چھائے غیر معمولی پن کو محسوس کیا۔

”آپ کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے۔“ اس نے ہول کر ان کے ہاتھ تھامے۔ اس کا چہرہ سفید اور منہ خشک ہوگیا تھا۔ ہارون آگے آیا۔

”ہم لیٹ ہو رہے ہیں، وہاں سے آنے کے بعد بات کرتے ہیں۔“

اس مداخلت پر اس کا دل کیا کہ اسے دھکا دے کر دور کرے کہ آپ ہم دونوں کے بیچ نہ بولیں۔

”آتے ہیں بیٹا۔“ ماموں جان نے اس کی تسلی کی خاطر مسکرا کر کہا اور ہارون کے ساتھ باہر نکل گئے۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی انہیں دیکھتی رہی تھی۔

ان کے واپس آنے تک وہ سارے گھر میں جلے پیر کی بلی کی طرح گھومتی رہی۔ اسے خیال ہی نہیں رہا کتنے گھنٹوں سے اس کی ٹانگیں اور دعا کرتے لب مسلسل چل رہے تھے۔ گاڑی رکنے کی آواز پر اس نے جھپٹ کر دروازہ کھولا تھا۔ ہارون ماموں جان کو سہارا دے کر اترنے میں مدد کر رہا تھا۔ اس کے دل پر ایسا گھونسا پڑا کہ آنکھیں چھلک اٹھیں۔

”یہ کیا ہوگیا ہے دو دن میں ماموں جان کو؟“ ان کے اندر آنے سے پہلے اس نے رگڑ کر آنکھیں صاف کیں۔ ہال میں آ کر ماموں جان اپنے دیوان پر لیٹ گئے۔

”کیا ہوا؟“ اس نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

”سی ٹی اسکین کی رپورٹ ابھی ملی نہیں ہے، سر کے پیٹ میں درد تھا اس لئے ہوسپٹل ہوتے ہوئے آئے ہیں، ڈاکٹر نے درد کا انجکشن دیا ہے۔“ ہارون نے جواب دیا۔

”صوفی!“ ماموں جان نے اسے پکارا۔ وہ فوراً دیوان پر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

”جی ماموں جان۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سینے پر رکھا اور رونے لگے۔

”ماموں جان۔“ انہیں یوں روتا دیکھ کر وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکی اور خود بھی رونے لگی۔

”ماموں جان!“ اس کی پکار کا ان پر کوئی اثر نہیں تھا۔ اس نے گھبرا کر پاس کھڑے ہارون کو دیکھا۔ وہ ان کے سرہانے اور صوفی کے پیروں کے قریب پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

”سر، سنجالیں خود کو۔“ اس نے بہت نرمی اور آہستگی سے کہا۔ ماموں جان نے آنسوؤں کے درمیان سر ہلایا اور ذرا دیر بعد سنبھل کر صوفی کا ہاتھ تھپتھپایا۔

”جو اس کی مرضی بیٹا۔“ انہوں نے اسے دیکھ کر مسکرانا چاہا لیکن پہلی بار ان کی بے جان مسکراہٹ دیکھ کر وہ زبردستی بھی مسکرا نہ سکی۔

”آپ آرام کریں سر۔“ ہارون واپس کھڑا ہو گیا۔

وہ اپنے اندر طوفان کی شکل میں اٹھ رہے سوالوں کو چہرے پر لائے بغیر ان کا ہاتھ سہلاتی وہیں بیٹھی رہی۔

کچھ دیر بعد انجکشن کے زیر اثر وہ سو گئے تھے۔

”ذرا آؤ، بات کرنی ہے۔“ ان کے سو جانے کا یقین ہوتے ہی صوفے پر بیٹھا ہارون کھڑا ہوا تھا۔ بات تو اسے بھی کرنی تھی۔ وہ اس کے پیچھے صحن میں آ گئی۔

”یہاں نہیں کمرے میں۔“ ہارون نے اسے صحن میں ٹھہرتے دیکھا تو اس کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ چپ چاپ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ہارون بھی۔

”صبر اور حوصلے سے سنو، زندگی اور موت اللہ کے......“ اس تمہید کی صوفی کو ضرورت نہیں تھی۔ اسے اصل بات جاننا تھی۔

”ماموں جان کو کیا ہوا ہے؟“ اس کے سیدھے سوال پر ہارون چپ ہو گیا۔ لیکن کب تک خاموش رہتا۔

”پینکریٹک کینسر، اور وہ لاسٹ اسٹیج۔“

”چٹاخ۔“ اسے خود بھی نہیں پتہ کیسے اسکا ہاتھ اٹھا تھا۔

”سس...... سس...... سوری۔“ وہ پیچھے ہٹی۔ اس کا پل میں چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ ”پتا نہیں کیسے...... میں......“ اس نے زور سے مٹھیاں بند کیں۔

”ماموں...... یہ سب...... لاسٹ...... نہیں......“ بے ربط چند الفاظ کہتے ہوئے اس نے کانوں میں گونجتے

''لاسٹ اسٹیج'' کی بازگشت کو روکنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے، لیکن اسکے بعد بھی وہ شور کم نہ ہوا تو اس نے کانوں سے ہاتھ ہٹا کر اپنی چیخ دبانے کے لئے منہ پر رکھے اور لرزتی ٹانگوں کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔

عارض پر پڑنے والے اس کی انگلیوں کے لمس کو بھول کر ہارون بے بسی اور دکھ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی کبھی گمان کی آخری سرحدوں سے پرے کا ایسا صدمہ جھیل چکا تھا۔ عبدالحمید سر کی بیماری کا انکشاف اس کے لئے بہت بڑا دکھ اور صدمہ تھا۔ پھر وہ تو ان کی چہیتی صوفی تھی۔ صوفی کے لیے اس کی ناپسندیدگی اپنی جگہ اور ماموں بھانجی کی محبت اپنی جگہ۔ جس پر اسے رتی برابر شک نہیں تھا۔ وہ پچھلے ایک سال سے ان دونوں کو ایک دوسرے کے لیے جیتے دیکھ رہا تھا بلکہ وہ دونوں تو ایک دوسرے کی پوری دنیا تھے۔

''ایسا نہیں ہوسکتا ہے۔'' وہ اب بڑبڑانے والے انداز میں بول رہی تھی۔ ''ماموں جان نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا...... کبھی بھی نہیں...... پھر ان کے ساتھ ایسا کیوں...... کیوں؟'' وہ دونوں مٹھیوں میں دوپٹہ پکڑے اور پیر کے انگوٹھے بھینچے بڑی شدت سے بول رہی تھی۔

ہمارے یہاں اکثریت کا یقین ہے کہ کینسر کا مرض برے لوگوں کو اللہ کی طرف سے اس دنیا میں ہی سزا ہوتی ہے۔ یہ خیال سراسر غلط سہی لیکن اس قسم کی باتیں اور مفروضات اس مرض میں مبتلا لوگوں کے عزیزوں کے دلوں پر کیسے اثر کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہی جانتے ہیں۔ ان کا درد اس قسم کے خیالات سے بہت الگ درجے پر پہنچ جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نیک لوگوں کے لیے آخری وقت کی مشکلات اور کڑا وقت بھی اللہ کی طرف سے ان کی آخرت سنوارنے کے لئے ہوتا ہے۔ صوفی کا اول الذکر بات پر یقین نہ سہی لیکن یہ سنی سنائی کا ہی اثر تھا کہ پہلا خیال اس کے ذہن میں بھی یہی آیا کہ ماموں جان جیسے نیک بندے کو کینسر کیسے اور کیوں؟

''وہ اتنے نیک ہیں اور پھر ان کے ساتھ......'' اس کی عقل جواز ڈھونڈنے میں لگی تھی۔ نادان کو یہ علم نہیں کہ مرض الموت کا جواز صرف موت ہوتا ہے۔

''صفیہ!'' ہارون نے پکارا لیکن وہ بے قراری سے ہونٹ کاٹتی بے آواز سوچوں میں گم تھی۔

''صفیہ! صوفی۔'' اب کے ہارون نے ذرا بلند آواز میں پکارا تو اس نے سر اٹھایا۔

"تمہیں خود کو سنبھالنا ہوگا، سر کے سامنے اس طرح روؤ گی تو......" اسے سوجھا نہیں کیا کہے۔ "انہیں بہت دکھ ہوگا یا پھر وہ آرام سے جا نہیں پائیں گے۔" وہ سوچ کر رہ گیا۔

"میں کیسے نہ روؤں؟" اس کی آواز میں غصہ تھا۔ "میں آپ کی طرح بے حس نہیں ہوں۔"

یہ دوسرا فقرہ قطعی غیر ضروری تھا۔ اس وقت اس کی حالت ہارون سے بہتر کوئی اور نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ بھی ایک ایسی ہی اچانک اور غیر متوقع افتاد جھیل چکا تھا۔ وہ بھی اس بے بسی، بے یقینی اور غصے کی حالت سے گزر چکا تھا۔ درد اور صدمہ اس کے بعد کا مرحلہ ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا تھپڑ بھی جائز تھا اور یہ فقرہ بھی۔ اسے اس وقت سب کی اجازت تھی، اسے سب کچھ معاف تھا۔

"یہاں تنہائی میں جتنا رونا ہے رو لو، لیکن سر کے سامنے بالکل رونا نہیں ہے۔ یہ آسان نہیں ہے پھر بھی......"

"کون سے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے آپ انہیں؟" ہارون کی بات کاٹ کر وہ کھڑی ہوئی۔ "ہمیں انہیں آنکولوجسٹ کو دکھانا ہوگا، یہاں نہیں تو ہم انہیں ملک سے باہر لے جائیں گے، ہادی بھائی ہیں نا اور اگر وہ مدد نہ بھی کریں تو میں سب کر لوں گی، پیسوں کی فکر نہ کریں، ماموں جان نے میرے لیے بہت جمع کر رکھا ہے، ضرورت پڑی تو ہم یہ مکان فروخت کر دیں گے۔" وہ نئے خیال کے تحت پر جوش ہو گئی تھی۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ "ہم" کہہ کر اس نے اپنے مسئلے میں ہارون کو بھی شامل کر لیا ہے۔

"ہاں، ہمارے اختیار میں جو ہے ہم وہ سب کریں گے۔" وہ اس کی ساری امیدیں ایک جھٹکے میں ختم نہیں کر سکتا تھا۔

"میں سی ٹی اسکین کی رپورٹس لے کر آتا ہوں۔" ہارون نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم اس کے بعد ہی آگے کی پلاننگ کر سکتے ہیں۔"

صوفی نے سر ہلایا۔

"میری غیر موجودگی میں سر جاگ جائیں تو تم......"

"میں نہیں روؤں گی۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کا مطلب سمجھ کر صوفی نے دوپٹے سے چہرہ

صاف کرتے ہوئے کہا۔ ہلکی سی امید والی بات سے ہی وہ حوصلہ پا گئی تھی۔ ہارون بھاری ہوتے دل کے ساتھ باہر نکل گیا۔ وہ سی ٹی اسکین کی زبانی رپورٹ سن کر آیا تھا اور اس میں ہلکی سی امید والی بھی کوئی بات نہ تھی جو ابھی اس نے صوفی سے کہی تھی۔

ہارون کے جاتے ہی صوفی وضو کر کے نماز کے لیے کھڑی ہو گئی تھی۔ جانے کتنی ہی دیر وہ اپنے رب کے آگے سر بہ سجود دعائیں کرتی رہی تھی کہ ماموں جان جاگ گئے۔ عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ ماموں جان نے اٹھ کر پہلے عصر کی نماز ادا کی۔ تب تک وہ ان کے لئے چائے بنا کر لے آئی تھی۔

"ہارون کہاں ہے؟" اس کے ہاتھ کی چائے کا کپ لیتے ہوئے ماموں جان نے پوچھا۔

"وہ آپ کی رپورٹس لینے گئے ہیں۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ تبھی باہر دروازے پر دستک ہوئی۔

"لگتا ہے آ گئے۔" وہ تیزی سے اٹھ کر صحن میں آ گئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے پھوپی کے ساتھ تایا جان، تائی، سیف اور صفوان کھڑے تھے۔ یہ بے وقت کی آمد اسے سخت ناگوار گزری۔

"السلام علیکم۔" چار و نا چار اسے سلام کر کے سب کو اندر آنے کی جگہ دینی پڑی۔

ماموں جان بھی ان سب کو ایک ساتھ دیکھ کر حیران تھے۔ ممانی جان کے انتقال کے وقت اور پھر اشمد کے لیے اس کا رشتہ مانگنے کے علاوہ تایا جان کا آج یہ تیسرا چکر تھا اور یقیناً آج بھی کوئی خاص مقصد ہی انہیں یہاں کھینچ لایا تھا۔

"کیسے آنا ہوا؟" رسمی دعا سلام کے بعد ماموں جان نے تایا جان کو مخاطب کیا۔

انہوں نے بھی ادھر ادھر کی باتوں میں وقت برباد کرنے کی بجائے سیدھا اپنا مدعا بیان کیا مگر سلیقے سے۔

"صفیہ کی دیکھ بھال اور پرورش آپ نے قابل تحسین طریقے سے کی ہے، اس کے لیے ہم سب آپ کے شکر گزار ہیں۔ وہ ہماری بھی بیٹی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جس طرح اب تک آپ اس کے لیے فیصلے لیتے آئے ہیں آگے بھی اسکی زندگی کے ہر فیصلے کا اختیار آپ کو ہی حاصل ہے۔ صفیہ بیٹی کی عمر ہو گئی ہے شادی کی، اس سلسلے میں یقیناً آپ نے بھی کچھ سوچ رکھا ہوگا۔"

تایا جان کی اتنی لمبی بات اسے کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔

"کہیں کوئی بات وغیرہ چل رہی ہے؟"

"ہاں، ایک جگہ سلسلہ جاری ہے۔"

"کہاں؟" پھوپی نے بے قراری سے پوچھا۔

"آپ نہیں جانتیں ان لوگوں کو، اس شہر سے نہیں ہیں۔"

پھوپی ہنس پڑیں۔

"بھائی صاحب! کب تک یہ بہانے کریں گے آپ؟"

"طاہرہ بی بی، اس ماہ میں بلکہ چند دنوں میں ہی صوفی کی شادی ہو جائے گی۔"

"ہمیں آپ کی نیت پر شبہ نہیں ہے بھائی صاحب۔" تائی جان نے پھوپی کی بات کا اثر زائل کرنا چاہا۔

"ہمیں بھی تو کچھ بتائیں، کون لوگ ہیں؟ کہاں سے ہیں؟ لڑکا کیا کرتا ہے؟"

"ہارون میرا شاگرد، آپ سب اسے جانتے ہی ہیں، اس کے توسط سے بات چل رہی ہے۔ لڑکا لیکچرر ہے، پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہا ہے، ممبئی میں رہتا ہے آبائی وطن یوپی میں ہے۔" ماموں جان اتنی بات کہنے پر ہی لمبی لمبی سانس لینے لگیں۔ ان کی علامتیں اچانک ظاہر نہیں ہو رہی تھیں۔ بہت کچھ موسمی اثرات اور عمر کا تقاضہ جان کر نظر انداز ہو گیا تھا اور باقی بدہضمی اور پیٹ کی خرابی مان کر۔ لیکن کل تک بیماری کا علم نہیں تھا تو کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ کیسے اس نے اتنی لاپرواہی برتی؟ کیوں اس نے غور نہیں کیا؟ یہ جمگھٹا اور باتیں اسے بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ اس کا بس چلتا تو وہ ہاتھ پکڑ کر ان سب کو باہر نکال دیتی۔

"صوفی! سب کے لیے چائے تو لے آؤ بیٹا۔" ماموں جان نے اس کے چہرے پر پھیلتا غصہ بھانپ کر اسے منظر سے باہر بھیجا۔

کچن میں آ کر اس نے ہال کا دروازہ بند کر دیا۔ ادھر کی باتیں سن کر اس کیلئے خود پر قابو رکھنا مشکل تھا۔ آخری مرتبہ پھوپی کا دیا طعنہ اسے یاد تھا۔ ماموں جان کے سامنے اس کی جانب سے مزید کوئی بداخلاقی کا مظاہرہ نہ ہو اس لئے مناسب یہی تھا کہ وہ ان کی باتیں اپنے کانوں میں پڑنے نہ دے۔

چائے چڑھانے کے بعد وہ بسکٹ ٹرے میں نکال رہی تھی کہ صحن کے دروازے کے باہر کار رکنے کی آواز

آئی۔ دستک سے پہلے ہی اس نے صحن میں آ کر دروازہ کھولا۔ ہارون آیا تھا۔

"کوئی آیا ہے؟" اندر سے آتی آوازوں پر ہارون نے پوچھا۔

"آپ یہ مجھے دے دیں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا کر اس کے ہاتھ میں نظر آ رہے بڑے سے لفافے کی طرف اشارہ کیا۔ ہارون وہ اسے دینا نہیں چاہتا تھا۔

"میں نہیں چاہتی اندر بیٹھے لوگوں میں سے کسی کو بھی فی الحال اس کا علم ہو۔" اس کا تذبذب دیکھ کر صوفی نے کہا۔ وہ پھر بھی یوں ہی کھڑا رہا تو اس نے جھک کر ہارون کے ہاتھ سے لفافہ لیا اور کچن میں آ گئی۔ ہارون نے اسے کچن میں جاتے ہوئے دیکھا پھر خود ہال میں چلا گیا۔

کچن میں آ کر اس نے لرزتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا ہی تھا کہ ہال سے ماموں جان کی آواز آئی۔

"صوفی!"

"لا رہی ہوں ماموں جان۔" اس نے لفافہ فریج پر رکھا اور چائے نکال کر ٹرے لیے ہال میں آ گئی جہاں ہارون کے تعارف کا مرحلہ مکمل ہو چکا تھا۔ اس کا نام اس شہر سے جڑے کامیاب ترین لوگوں کی فہرست میں سب سے اوپر تھا اس لئے غائبانہ طور پر اسے سبھی جانتے تھے۔

تایا جان کے اصرار پر ماموں جان نے ہارون کو اسی وقت تنویر سے بات کرنے کو کہا۔

"بیٹا! میں چاہتا ہوں اس ہفتے جب تنویر والدین کے ساتھ آئے تو اسی وقت ہم صوفی کا نکاح کر دیں، اور رخصتی وہ جب چاہے اپنی مرضی سے کروائیں۔" ماموں جان کے پاس اس جلد بازی کی صرف ایک وجہ نہیں تھی۔ ان سب کو ان تیوروں کے ساتھ اپنے سامنے دیکھ کر انہیں اچانک ہی اپنے بعد صوفی کے بالکل تنہا اور کمزور ہو جانے کا احساس ہوا تھا، جہاں کوئی بھی اس پر زبردستی اپنی مرضی کے فیصلے تھوپ سکتا تھا۔ یہ عجلت اسے مضبوط کرنے اور قوت دینے کے لئے تھی۔ ہارون فون لگاتے ہوئے صحن میں چلا گیا تھا۔

"اب یوں بھی کیا ہتھیلی پہ سرسوں جمانا بھائی صاحب۔" یہ نئی ڈیولپمنٹ پھوپی کے من کے مطابق نہیں تھی۔ سیف کا چہرہ بھی تنا ہوا تھا۔

"طاہرہ بی بی! آپ کی ہی بات دل پر لگی ہے کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں اس لیے بہتر ہے میں اپنی آنکھوں

کے سامنے ہی صوفی کو اس کے گھر کا کر دوں۔"

صوفی کا دل بڑا تڑپ کر سکڑا اور پھیلا تھا۔

"ہاں، لیکن یوں چٹ پٹ شادی کیوں کر رہے ہیں آپ؟" کل تک چٹ پٹ کے لیے اکسانے والی پھوپی کو اب اسی پر اعتراض تھا۔"ایسے معاملوں میں چھان بین ضروری ہوتی ہے۔ جانے کون نئے اور انجان لوگ ہیں، وہ جو کہیں ہم اسے ہی سچ مان کر کیسے اپنی بیٹی انہیں سونپ دیں، بہتر ہے پہلے ہم اپنے طور پر جانچ پڑتال کر لیں۔" اور یہ جانچ پڑتال وہ کس سے کروانا چاہتی تھیں تمام حاضرین کو اندازہ تھا۔

"میرے لیے ہارون بہت قابل بھروسہ اور معتبر ہے، وہ ساری تسلی کے بعد ہی تنویر کو گھر تک لایا ہے، اس کا مجھے یقین ہے۔"

"بھائی صاحب!" انہوں نے یوں کہا جیسے ماموں جان کی نادانی پر تاسف کا اظہار کر رہی ہوں۔"ایک انجان کی اچھائی اور سچائی کی تصدیق کے لیے آپ دوسرے انجان پر بھروسہ کر رہے ہیں۔"

"طاہرہ!" تایا جان نے مداخلت کی۔"عبدالحمید جس رشتہ کا کہہ رہے ہیں وہ ہر لحاظ سے سیف کے مقابلے میں بہتر ہے۔"

اس صاف گوئی پر سیف سب سے زیادہ بے آرام ہوا۔ پھوپی کو بھی بھائی کے یوں پانسہ بدلنے کی امید نہیں تھی۔ وہ جز بز سی چپ ہو گئیں۔

صوفی نے چائے کے خالی کپ ٹرے میں جمع کیے اور کچن میں چلی آئی۔ اس نے پھر ہال میں کھلنے والا دروازہ آدھا بند کر دیا تھا۔ ہارون صحن کے ایک گوشے میں کھڑا فون پر بات کر رہا تھا۔ صوفی نے کان لگا کر اس کی گفتگو سننے کی کوشش کی لیکن فاصلہ زیادہ تھا یا پھر وہ سرگوشیوں میں بات کرنے میں مشاق تھا۔ بے کلی مسلسل اس کے اندر پھیلتی جا رہی تھی۔ رشتہ، نکاح، شادی یہ ان سب باتوں کا وقت نہیں تھا بلکہ اس وقت اولین ترجیح ماموں جان کا علاج تھی۔ اسے ایکدم لفافہ یاد آیا۔ اس نے جھپٹ کے فریج سے لفافہ اٹھا کر اس میں سے پرنٹڈ رپورٹ نکالی۔ پینکریٹک ایڈینو کارسینوما، کم و بیش بطن کے تمام اعضا کو متاثر کر چکا تھا، پھیپھڑے اور لمف نوڈس بھی اسکی لپیٹ میں آ چکی تھیں۔ اس نے فریج پر رکھا اپنا فون اٹھایا اور کی ورڈس گوگل سرچ کیے۔

ہارون فون بند کر کے ہال میں جانے لگا تو کھلے دروازے سے صوفی پہ نظر پڑی۔ وہ مسلسل آنسو بہاتی آنکھیں فون پر مرکوز کیے اسکرین اسکرول کر رہی تھی۔ وہ ہال میں جانے کی بجائے کچن میں آیا اور صوفی کے ہاتھ سے فون لے لیا۔ اس نے ٹھٹھک کر اوپر دیکھا۔ وہ فون بند کر کے کاؤنٹر پر رکھ رہا تھا۔

"کتنا...... کتنا وقت ہے ماموں جان کے پاس؟" اسے اپنے منہ سے نکلنے والے الفاظ اجنبی لگ رہے تھے۔ اس وقت وہ خود الجھا ہوا تھا کہ تنویر کے والدین صوفی کے لیے راضی تو تھے لیکن فوراً شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تنویر پھر بھی انہیں راضی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صوفی کا سوال اس کے ذہن میں ذرا دیر سے رجسٹر ہوا تھا۔

"چند مہینے یا چند ہفتے۔" اس کی آنکھوں میں بے یقینی پھیلی اور وہ اس انداز میں ڈھیلی پڑی تھی کہ ہارون کو لگا ابھی زمین پر گر کر دھاڑیں مارنے لگے گی۔ وہ ذرا سا لڑکھڑائی مگر کچن کاؤنٹر کا سہارا لے کر سنبھل گئی۔ ہارون نے اسٹول پر رکھی پر عذر رپورٹ واپس لفافہ میں ڈالی۔ صوفی نے دوپٹے سے رگڑ کر چہرہ صاف کیا پھر ہارون سے بولی۔

"پہلے آپ ان سب کو روانہ کریں، صرف چند رپورٹس دیکھ کر کوئی حتمی فیصلہ ٹھیک نہیں، ہمیں پہلے اسپیشلسٹ سے کنسلٹ کرنا ہوگا۔"

کبھی کبھی امید، خوش فہمی اور غلط فہمی میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ صوفی کی بات ختم نہیں ہوئی تھی لیکن ہارون کا فون وائبریٹ ہونے لگا۔ وہ رک گئی تھی۔ تنویر کا فون تھا۔ اس نے لفافہ صوفی کو دیا اور صحن میں چلا گیا۔

"یا اللہ! اس کے پاس کوئی اچھی خبر ہو۔" فون ریسیو کرتے ہوئے اس نے دل میں دعا کی لیکن یہ قبولیت کا وقت نہیں تھا۔

تنویر کے والدین اسی ہفتے نکاح کے لئے تیار نہیں تھے اور اس کی وجہ سن کر ہارون کو غصہ آ گیا۔ اپنے بیٹے کی یہ خوشی وہ ایک قریب المرگ کی موجودگی میں کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ اس کی امی کے نزدیک یہ بدشگونی تھی۔ تنویر اپنی دلیلوں اور التجاؤں کے بعد بھی ان کا یہ خیال بدل نہیں پایا تھا۔

تنویر سے بات ختم کر کے پلٹا تو کچن کے دروازے میں صوفی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے ہوتے ہوئے ہارون کی نظر اس کے ہاتھ میں پکڑے لفافے پر ٹھہر گئی۔ اس وقت درد سے بوجھل ہوتے دل کے ساتھ وہ بے خبر تھا کہ زندگی میں ایک بار پھر وہ ایک مشکل، خلاف مرضی، اور ناپسندیدہ فیصلے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ پانچ

سال پہلے کی طرح دورا ہے پر کھڑے ہارون کے لئے اس بار بھی یہ مشکل، خلاف مرضی، اور ناپسندیدہ فیصلہ ہی درست فیصلہ تھا۔

صوفی نے اسے ایک نہ سمجھ میں آنے والے تاثر کے ساتھ ہال میں جاتے دیکھا۔ وہ خود بھی لفافہ واپس فریج پر رکھ کر ہال میں چلی آئی۔ لمبے انتظار کے باعث سبھی کوفت میں مبتلا تھے۔

''ہاں بھئی کب آ رہے ہیں وہ لوگ؟'' تایا جان نے ہارون کو مخاطب کیا۔

''سر! آپ دومنٹ......'' وہ جھجکتے ہوئے ماموں جان سے کہہ رہا تھا کہ انہوں نے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

''جو بھی بات ہے سب کے سامنے یہیں کہو۔''

ہارون ذرا توقف کے بعد گویا ہوا۔

''تنویر کے والدین کو یہ رشتہ منظور ہے لیکن وہ ابھی فوراً شادی کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

''دیکھا۔'' پھوپی میں نیا جوش بھر گیا۔ ''میں نے کہا تھا نا یہ سب بہانے ہیں۔''

ماموں جان کا سر جھک گیا۔ انہیں لگا آخری پتوار بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

''بھائی جان! آپ ایک بار سیف کے بارے میں غیر جانبداری سے غور تو کریں۔'' تائی جان نے کہا۔

''اپنا دیکھا بھالا لڑکا ہے، برسرروزگار ہے، صفیہ اپنوں میں رہے گی، اسی شہر میں آپ کے قریب رہے گی۔''

صوفی کو پھر رونا آنے لگا۔ ماموں جان کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اس نے خود پہ قابو کیا اور بڑھ کر دیوان پر ان کے بازو میں بیٹھ گئی۔ ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو انہوں نے اسکی سمت دیکھے بنا ہی مضبوطی سے انہیں پکڑ لیا۔

''ہاں انکل، سیف بھائی آپی کے لیے بالکل مناسب ہیں۔'' اب تک خاموش بیٹھے صفوان نے لب کشائی کی۔

''عبدالحمید! اگر کوئی اور رشتہ موجود نہیں ہے تو سیف ہر لحاظ سے قابل قبول ہے۔ بس ایک تعلیم کا فرق ہے اگر اسے نظر انداز کر دیا جائے تو انکار کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی ہے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب صفیہ بیٹی کی عمر شادی کی متقاضی ہے اور دوسرا متبادل موجود نہیں ہے۔'' ذرا دیر پہلے تایا جان نے ایسے ہی نپے تلے جملے سے پھوپی کو چپ کروا دیا تھا اور اب ماموں جان کی باری تھی۔

"اگر جلدی شادی کرنا ہے تو وہ بھی ہو جائے گی، کیوں طاہرہ؟"

"ہاں کیوں نہیں، مجھے تو بس آپ کی ہاں کا انتظار ہے۔"

ہارون ماموں بھانجی کے جھکے سروں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ لاکھ خود کو ان کا احسان مند اور قرض دار کہتا رہے لیکن اگر اس وقت تماشائی بنا رہا اور پھر اس پل کے بعد وہ ساری عمر چاہے جو کرے، یہاں تک کہ اپنی جان بھی دے دے مگر رہے گا احسان فراموش ہی۔ زبانی دعوے بڑے آسان ہوتے ہیں۔ نیت اور جذبے کی سچائی ایسے پل صراط جیسے لمحوں میں کھلتی ہے۔ جہاں لمحہ بھر میں آر یا پار کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ اس کیلئے احسان مندی کے عملاً مظاہرے کا وقت تھا۔

"ایک اور پرپوزل ہے۔" اتنی ساری آوازوں کے بیچ اس کی تیز اور مستحکم آواز ابھری۔ ماموں جان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اب بھی سر جھکائے اپنے اور ماموں جان کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

"کون؟"

"کس کا؟" سارے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ دیوان کے سامنے صوفے کے قریب کھڑا تھا۔

"اگر آپ قبول کریں سر" وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"ہا......رو......ن......" ماموں جان کی کانپتی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔ ہارون ماموں جان کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا......یعنی تم خود......" پھوپی ان سب میں سب سے پہلے سمجھی تھیں۔ شہر کی نامور شخصیت کے حالات زندگی سے بھی سب واقف تھے۔

"دس بارہ سال عمر میں بڑے اور دو بچوں کے باپ کے مقابلے میں اب بھی میرا پرپوزل زیادہ اچھا ہے۔" سیف کے اندر اچانک اعتماد جاگ گیا تھا۔ تعلیم کی کمی نے اسے اس کی اہمیت سے بھی بے بہرہ کر رکھا تھا۔

"ہاں بھائی صاحب، سیف اور صفیہ میں دو سال کا ہی فرق ہے۔"

"اور جب کنوارہ رشتہ موجود ہے تو کیوں اسے دوسری بیوی بنائے۔"

"بچے بھی چھوٹے نہیں ہیں، اچھی عمر ہے اور اس عمر میں دوسری ماں کو قبول کرنا آسان نہیں ہوتا۔"

"غیروں پر اپنوں کو ترجیح ملنا چاہیے۔"

وہ سب باری باری سیف اور ہارون کا موازنہ کرتے ہوئے سیف کو لائق و درست امیدوار ثابت کر رہے تھے۔

"ایک منٹ۔" صوفی کی اونچی آواز پر سناٹا چھا گیا۔

"میری شادی کے لئے سب سے ضروری اور مقدم میری مرضی اور میری رائے ہے۔" اس نے ماموں جان کو دیکھا۔ "ہے نا ماموں جان؟"

انہوں نے سر ہلا کر ہاں کہا۔

"تو میرا فیصلہ ان کے حق میں ہے۔" اس نے دیکھے بغیر ہی ہاتھ سے ہارون کی سمت اشارہ کیا۔

ماموں جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو چند آنسوان کے گالوں پر بھی لڑھک آئے تھے جنہیں صوفی نے فوراً پونچھ ڈالا۔

"آپی! ہم سب آپ کے خیر خواہ ہیں۔" صفوان نے اسے مخاطب کیا۔ "ہم بھی آپ کے لئے......"

"صفوان!" اس کی سمت پلٹ کر صوفی نے بات کاٹی۔ "اگر آج سے پہلے مجھے تمہاری طرف سے خیر خواہی کا ایک بھی اشارہ یا ثبوت ملا ہوتا تو میں آنکھیں بند کر کے اس وقت تمہاری بات مان لیتی۔" سادگی سے کہے اس جملے نے صفوان کو خاموش کرا دیا تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر باقی سب بھی چپ رہے۔

"سر! آپ جس دن کہیں میں نکاح کے لئے تیار ہوں بس میری ایک شرط ہے۔" وہ آگے آیا۔ "اس کے بعد آپ دونوں کو میرے ساتھ میرے گھر چلنا ہوگا۔"

"ہاں۔" ماموں جان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی صوفی نے کہا لیکن ہارون اب بھی ماموں جان کو دیکھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" ذرا توقف کے بعد انہوں نے بہت آہستہ سے کہا جسے صرف وہ دونوں ہی سن پائے تھے۔

سیف جھٹکے سے اٹھا اور باہر نکل گیا اس کے پیچھے صفوان بھاگا۔ پھوپی کچھ کہنے کی تیاری میں تھیں لیکن تایا جان نے انہیں اشارے سے روک دیا۔

"مبارک ہو عبدالحمید۔" انہیں اب ان تینوں کو دیکھ کر غیر معمولی پن کا احساس ہو رہا تھا۔ ماموں جان کا فوراً شادی پر اصرار اور ہارون کا یوں لمحوں میں اتنا بڑا فیصلہ، بہت بڑی اور سنجیدہ وجہ کی طرف اشارہ تھا۔

"ہارون انصاری جیسا قابل داماد سب کو نہیں ملتا۔ آپ کو بھی مبارک ہو برخوردار۔" انہوں نے ہارون سے

کہا۔" آپ دن اور وقت طے کر کے ہمیں بھی اطلاع کر دیں تو مہربانی ہوگی۔"

"جی ضرور۔"

"کل وقت نکالنا ممکن ہے تمہارے لیے؟" ماموں جان نے ہارون سے پوچھا۔

"جی، شام میں عصر یا مغرب کے بعد؟"

"عصر کے بعد مناسب رہے گا۔" ہارون کو جواب دے کر وہ تایا جان سے مخاطب ہوئے۔" آپ سب کو اطلاع اور میری طرف سے دعوت بھی دے دیں تو بڑا احسان ہوگا۔"

"احسان کی کیا بات، اس طرف سے بے فکر رہو، کوئی اور کام ہو تو بتاؤ۔"

"آپ سب کل نکاح میں شامل ہو جائیں، انتظامات اور کام کی فکر نہ کریں، میں سب سنبھال لوں گا۔" ہارون نے کہا۔

"چلتے ہیں پھر۔" تایا جان اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے۔

"کل ملاقات ہوگی۔" انہوں نے ہارون سے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے کیا۔ گویا انہیں وہ قبول تھا۔ پھوپی اور تائی جان کے تاثرات تایا جان سے مختلف تھے۔

ان کے جانے کے بعد ہال میں وہ تینوں ہی رہ گئے تھے۔ صوفی دم سادھے منتظر تھی کہ ابھی ماموں جان سی ٹی اسکین کی رپورٹ کے بارے میں سوال کریں گے۔ لیکن جو باتیں وہ سن رہے تھے اس کے بعد انہیں کسی ٹیسٹ، رزلٹ یا رپورٹ میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

"ہارون! آج تم نے مجھ پر......"

"سر!" وہ آگے آ کر ان کے پیروں کے قریب فرش پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔" اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے، کاتبِ تقدیر کی مرضی ہے، یہ ایسے ہی ہونا لکھا تھا، بس وقت اور حالات وہ نہیں جیسے آئیڈیلی ہونے چاہئیں۔"

اس کے کتنے زخم اس فیصلے سے ادھڑ گئے تھے، یہ وہ ہی جانتا تھا لیکن عبدالحمید سر کے اطمینان اور تسلی کے لیے وہ ایسے ہی زخم زخم کرنیوالے سو فیصلے اور لے سکتا تھا۔ اس نے یہ صدفی صد سچ بات صرف ان کی خاطر کہی تھی۔

ماموں جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''جیتے رہو، خوش رہو۔'' ماموں جان کی آواز بھیگی تھی۔

''آپ بہت دیر سے بیٹھے ہیں، اب لیٹ جائیں۔'' صوفی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

''ابھی تو کل کی تیاریاں کرنی ہیں بیٹا۔'' انہوں نے خوش دلی سے مسکرانے کی ناکام سی کوشش کی۔

''آپ ساری فکریں چھوڑیں، میں سب کرلوں گا۔ آپ آرام کریں۔'' ہارون نے کھڑے ہو کر ان کا تکیہ درست کرتے ہوئے کہا۔

''عصر ہونے والی ہے بیٹا۔'' وہ کھڑے ہوگئے۔ ''میں نماز کے لئے وضو کرلوں۔'' وہ صحن میں لگے واش بیسن میں وضو کرنے چلے گئے۔ وہ دونوں اپنی جگہ کھڑے تھے۔

''سر کی دوائیوں میں نیند کی ٹیبلٹ بھی ہے، وہ انکار کریں گے لیکن انہیں وہ دینا ضروری ہے۔'' ہارون اسے آگاہ کر رہا تھا۔ ذرا دیر پہلے ہی ان دونوں نے لمحوں میں اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کیا تھا لیکن فی الحال وہ اس کے متعلق نہ سوچ رہے تھے نہ سوچنا چاہتے تھے۔ ایک بڑے مسئلے کے حل کے لیے نسبتاً چھوٹے مسئلے کا پیوند لگایا تھا۔ اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ ہارون بھی صحن میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں نماز کے لیے کھڑے ہوگئے تو وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ماموں جان کے بار بار کہنے پر بھی کہ اسے کل کے لئے بہت سارے کام ہیں، وہ دیر رات تک رکا رہا تھا۔ اس نے اسی وقت صوفی کو ان دونوں کی پیکنگ پر لگا دیا تھا۔ وہ آنسو بہاتی، بھی چپتی دوسرے گھر جانے کی تیاریوں میں لگ گئی تھی۔ کھانے کے بعد وہ ان دونوں کو چائے دینے آئی تو ماموں جان اس کے سامنے اپنے پاس بکس، چیک بکس، پراپرٹی کے پیپرز اور دیگر دستاویزات و کاغذات کھولے بیٹھے تھے۔ وہ سب کچھ پھاڑنے اور اٹھا کر پھینکنے کی خواہش دبا کر واپس کمرے میں چلی آئی۔ اس کا سب سے قیمتی سرمایہ اس سے چھن رہا تھا جس کے مقابلے میں یہ مادی سرمائے قطعی بے وقعت تھے۔ چیزوں کے ساتھ ساتھ اس کے آنسو بھی بیگز میں بند ہونے لگے تھے۔

✡......✡......✡

گھر واپس آتے ہوئے اس نے راستے سے ہی فاطمہ آپا کو فون کر کے ساری بات بتا دی تھی۔ حسب توقع وہ اس کے فیصلے سے خوش تھیں نہ متفق پھر بھی اس کا ساتھ دینے پر تیار تھیں۔ گھر پہنچا تو دونوں بچے جاگ رہے تھے۔

"آپ دونوں سوئے نہیں؟"

"آپ کا ویٹ کر رہے تھے۔" اس کے پیروں سے لپٹی ہنزہ نے جواب دیا۔

"گڈ" اس نے ہنزہ کو گود میں اٹھایا۔ "مجھے آپ دونوں سے بات کرنی ہے۔" وہ انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں آیا۔

حمود باپ کے چہرے کی سنجیدگی بھانپ کر خود بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"دادا جان اور صوفی ......" وہ دونوں انہیں اسی طرح مخاطب کرتے تھے۔ "کل سے ہمارے ساتھ یہاں اسی گھر میں رہیں گے۔"

"واہ!" ہنزہ اٹھ کر تالی بجاتے ہوئے کودنے لگی۔ اس تناؤ زدہ حالت میں بھی وہ مسکرا دیا۔

"دادا جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے آپ دونوں کو اس بات کا خاص خیال رکھنا ہے کہ انہیں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو، وہ تنگ نہ ہوں۔"

دونوں نے سر ہلا کر باپ کا حکم بجا لانے کا وعدہ کیا۔

"کل صبح ہم انہیں لینے جائیں گے، آپ کو اسکول سے چھٹی کرنی ہوگی۔"

"لیکن کل میرا آرٹ اینڈ کرافٹ ہوتا ہے پاپا۔" ہنزہ نے انگریزی میں کہہ کر ناک چڑھائی۔

"کوئی بات نہیں، آپ ایک دن کی کرافٹ کلاس مس کر سکتے ہو۔" اس نے بھی انگریزی میں کہا۔ آرٹ اینڈ کرافٹ کلاس کا ناغہ کرنا اس کے لئے ذرا بھی خوش آئند نہیں تھا لیکن پاپا کی بات ٹالنا بھی اسے نہیں آتا تھا۔

"او کے۔"

"آپ سو جائیں اب، بی بی......" ہارون نے گھر کی ملازمہ کو آواز دی۔ وہ فوراً حاضر ہوئیں۔ "ہنزہ کو سلا دیں۔" پھر وہ ہنزہ کی طرف مڑا۔

"آپ جائیں، میں آتا ہوں۔" وہ اس کے ساتھ ہی سوتی تھی۔

ان دونوں کے جانے کے بعد اس نے اپنے سنجیدہ، سمجھدار اور عقل مند بیٹے کو دیکھا جو دادا جان اور صوفی کی یہاں آمد کی اصل وجہ جاننے کا منتظر تھا۔

''آپ کے لیے یہ سب سمجھنا مشکل ہے بیٹا۔'' وہ گیارہ سالہ حمود سے کہنے لائق مناسب الفاظ سوچتے ہوئے رکا۔

''میں کوشش کروں گا۔'' حمود نے انگریزی میں کہا۔اس کے بعد دونوں کی ساری گفتگو اسی زبان میں ہوئی تھی۔

''حالات کچھ ایسے تھے کہ مجھے اسی وقت فیصلہ کرنا پڑا، یہاں آنے سے پہلے کل میری اور صوفی کی شادی ہے۔'' حمود کے لیے نکاح کی بہ نسبت شادی سمجھنا زیادہ آسان تھا۔وہ غور سے حمود کو دیکھ رہا تھا۔اسکے چہرے پر بے یقینی اور پھر حیرت پھیلی۔

''اوکے۔'' کچھ وقت لینے کے بعد اس نے کہا۔

''سر کی بیماری کی وجہ سے یہ فیصلہ کرنا پڑا۔''

''انہیں کیا ہوا ہے؟''

وہ لاکھ سلجھا اور اپنی عمر سے کہیں زیادہ سمجھدار تھا پھر بھی وہ اسے کہتے جھجک رہا تھا۔

''میں ہینڈل کرسکتا ہوں پاپا۔''

''ان کے پاس بہت کم دن رہ گئے ہیں بیٹا۔''

''کینسر......فورتھ اسٹیج......؟''

''ہمم۔''

''اوہ۔'' وہ اداس ہو گیا۔

''آپ ان کیلئے دعا کریں اور انہیں یہاں آرام پہنچانے اور خوش رکھنے کی کوشش کریں۔'' ہارون نے بیٹے کو آگے کی راہ دکھائی۔

''ضرور۔''

''اب آپ بھی سو جائیں۔صبح آنٹی آئیں گی،ہمیں ان کے ساتھ بھیونڈی جانا ہے۔''

http://sohnidigest.com

''اوکے، گڈ نائٹ۔'' وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ہارون کے آنے سے پہلے اسے بہت نیند آ رہی تھی۔ وہ ہنزہ کا ساتھ دینے کی خاطر جاگ رہا تھا۔ ہارون کی باتیں سننے کے بعد اب اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ وہ بستر پر جانے کے بجائے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز پر سامنے رکھی بلیو ڈائری اٹھا کر کچھ دیر ورق گردانی کرتا رہا پھر ہولڈر سے پین اٹھائی اور لکھنا شروع کیا۔

''ناٹ اگین......''

ہارون کمرے میں آیا تو ہنزہ سو گئی تھی اور بی بی اسٹول پر بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔

''شکریہ۔'' اس نے سوئی ہنزہ کو دیکھتے ہوئے کہا تو نیند سے بوجھل آنکھیں لیے وہ سر ہلا کر چلی گئیں۔ شب خوابی کا لباس نکالنے کے لئے وہ الماری کی طرف آیا لیکن آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر رک گیا۔

''ہارون انصاری، تو ایک بار پھر......'' اپنے عکس کی آنکھوں میں دیکھ کر اس نے دل ہی دل میں کہا۔

✿......✿......✿

صوفی اپنے کمرے کے بجائے ہال میں صوفے پر لیٹی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں میں رتی برابر نہ تھی۔ اس کا رواں رواں دعا گو تھا کہ یہ سب خواب ہو، صبح اس کی آنکھ کھلے تو پتہ چلے کہ یہ دو تین دن اس نے خواب میں گزارے ہیں۔ ماموں جان دواؤں کی وجہ سے گہری نیند میں تھے۔ ماموں جان کے فون کی رنگ پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے نمبر اور نام دیکھے بنا ہی کال ریسیو کی اور دبے قدموں سے صحن میں آ گئی۔

''ہیلو۔''

اس کی دبی دبی آواز کے جواب میں دوسری طرف سے ہادی کی سرد اور تلخ آواز آئی۔

''ابو کہاں ہیں؟''

''ہادی بھائی۔'' وہ رونے لگی۔

''تم کس لئے رو رہی ہو؟ تمہارے لئے تو کل خوشی کا دن ہے۔'' وہ غصے میں تھا۔ سیف نے اس کمال سے اسے فون پر ساری بات بتائی تھی کہ اپنے نظر انداز کئے جانے اور بے خبر رہنے سے زیادہ غصہ اسے ہارون پر تھا۔

''ہادی بھائی! ماموں جان۔'' وہ جلد سے جلد اسے ساری بات سنانا چاہتی تھی لیکن گلے میں اٹکے پھندے

نے اس کی آواز ضبط کرلی۔

''صفیہ! بات کیا ہے؟'' وہ اس کے انداز اور رونے پر چونکا اور اس نے سنبھل کر، رو رو کر سارا ماجرہ کہہ سنایا۔ ماموں جان کی بیماری، پھوپی کے تقاضے، تنویر کا قصہ اور ہارون کی بروقت مدد۔

اگلا دن تھا تو اس کے نکاح کا لیکن اس کے لیے مصروف ترین دن تھا۔ اس نے کل اپنی اور ماموں جان کی پیکنگ کرلی تھی۔ اب وہ سارے کمروں کا سامان ایک طرف جمع کر کے انہیں ڈھانکنے میں لگی تھی۔ مسلسل بہتی آنکھوں کی وجہ سے اب ناک بھی بہنے لگی تھی۔ وہ اپنی سوں سوں کے ساتھ دعائیں کرتے ہوئے مصروف تھی۔ جوڑا، چوڑی، مہندی سے بے نیاز وہ آج دلہن بننے والی تھی۔ ☆

تایا جان اطلاع دینے آئے تھے کہ انہوں نے قریبی رشتے داروں کو دعوت دینے کے ساتھ ساتھ شام کے کھانے کا انتظام بھی کرلیا ہے۔ ماموں جان اور اس کی امی کی جانب سے کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا۔ ماموں جان کے تین کزنز اور ان کے خاندان تھے، جن میں سے ان کے ایک عم زاد ہی اس شہر میں آباد تھے۔ اس وقت ماموں جان نے انہیں اپنی علالت کے متعلق سب بتا دیا۔ انہیں بھی شاید پہلے ہی اندازہ ہوگیا تھا۔ وہ صوفی کی شادی کا فیصلہ درست ٹھہراتے ہوئے ان سے وہی باتیں کرنے لگے جو کوئی کسی قریب المرگ شخص سے کرتا ہے۔ موت کے برحق ہونے کے، صبر کی باتیں، توبہ اور دعاؤں کی تاکید، صوفی کی فکر نہ کرنے کی تسلیاں۔ ان کی بات سن کر اس کا دل اور درد سے بھر گیا۔

''کاش! یہ ساری باتیں تایا جان پہلے آکر کرتے، ماموں جان کے آخری وقت کا انتظار نہ کرتے۔ تب ان کی اہمیت اور معنی بہت مختلف ہوتے۔''

''صوفی!'' ان کے جانے کے بعد ماموں جان نے اسے آواز دی۔

''جی۔'' وہ فوراً دوپٹے سے چہرہ رگڑ کر ہال میں آئی۔

''یہاں آؤ۔'' انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔ وہ دیوان پر ان کے بغل میں بیٹھ گئی۔

''بیٹا! تم ایسے روتی رہو گی تو مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے۔'' اپنی دانست میں تو وہ چھپ چھپ کر رو رہی تھی۔ ''سب کو ایک دن جانا ہے، اس نے جتنی زندگی لکھی ہے اس سے ایک پل زیادہ کوئی اس دنیا میں نہیں رہ سکتا۔ اس کا احسان ہے کہ میں نے ایک اچھی زندگی بسر کی ہے، اب اس کا بلاوا آیا ہے تو جانا ہی ہوگا۔''

وہ سارے احتیاط چھوڑ کر بے آواز رونے لگی۔

''صبر کرو بیٹا۔'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''میں پروردگار کا شکر گزار ہوں جو اس نے مجھے اتنی مہلت دی کہ میں تمہارا......''

''ماموں جان۔'' وہ ان سے لپٹ کر ہچکیوں اور آواز سے رونے لگی۔

''ہمت رکھو بیٹا، صبر کرو۔'' اس کی آہ و بکا میں ماموں جان کے خاموش آنسو بھی شامل ہو گئے۔ ان کا دل بھی کٹ رہا تھا۔ موت کی دستک انہوں نے قبول کر لی تھی۔ وہ بھی خوفزدہ تھے۔ ڈر انہیں بھی ستا رہے تھے اور یہ ان کی اپنی تنہا جنگ تھی۔ مکمل ہتھیار ڈالنے سے پہلے کی گھبراہٹ ان پر بھی سوار تھی۔

دوپہر سے پہلے ہی اس کی امی اور صفوان کی بیوی زنیرہ دلہن کا سارا سامان لے کر آئیں۔ وہ سب دیکھ کر اس پر عجیب وحشت سوار ہونے لگی تھی۔ اس کے لاکھ منع کرنے کے بعد بھی زنیرہ نے اسے مہندی لگائی تھی۔

ماموں جان نے دوپہر میں فون لگا کر ہادی سے اس کے نکاح کی بات کی لیکن اپنی بیماری کے تعلق سے کچھ نہیں کہا تھا۔ صوفی نے بھی انہیں اپنی اور ہادی کی پچھلی رات والی گفتگو کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں کہا تھا۔ انہیں یہ جان کر بہت دکھ ہوتا کہ اس خبر کے بعد بھی آنا تو دور اس نے خود فون کر کے بات بھی نہیں کی۔

عصر کے بعد، ہارون کے آنے سے پہلے ہی قریبی رشتے دار اور ماموں جان کے کچھ دوست آ چکے تھے۔ تایا جان کے کہنے پر پھوپی بھی پورے خاندان کے ہمراہ آئی تھیں۔ نکاح کے بعد کھانا ہوا اور ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے۔ سارا دن اس پہ یہی احساس حاوی تھا کہ جلد سے جلد یہ تماشہ ختم ہوتا کہ ماموں جان کا پراپر علاج شروع ہو سکے۔ اس نے قبول ہے، قبول ہے بھی اسی احساس میں گھرے بڑی جلدی جلدی کہا تھا۔ اس کی امی، زنیرہ اور تائی جان انہیں رخصت کرنے کے لیے رکی تھیں۔

ہارون کے ساتھ فاطمہ آپا، ان کے شوہر، تینوں بچے اور ان کی ساس تھیں۔ دو گاڑیوں میں ان سب کیساتھ

صوفی اور ماموں جان کا سامان تھا۔ہارون کی کار میں دونوں بچوں کے ساتھ وہ تینوں تھے۔آج ہارون ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ایک لمبے سفر کے بعد وہ چیمبور میں اس کے گھر پہنچے تھے۔اسے ادارے کی طرف سے ملا یہ چھوٹا سا بنگلہ الگ تھلگ تھا۔چاروں طرف احاطے کی دیوار تھی۔دیوار کے اندر اتنی زیادہ جگہ نہیں تھی کہ اسے لان کہا جاتا۔ڈرائنگ روم کے سامنے چھوٹا سا پورچ تھا۔دیوار کے ساتھ بنی کیاریوں میں پودے تھے۔بقیہ حصے میں پکا فرش تھا۔ہر بیڈروم کی کھڑکی احاطے میں کھلتی تھی۔واحد خالی بیڈروم پہلے ہی ماموں جان کے لیے تیار کر دیا گیا تھا۔فاطمہ آپا بس گاڑیوں سے صوفی اور ماموں جان کے بیگز اتار نے رکی تھیں۔اگر بات عبدالحمید سر کی نہ ہوتی تو وہ ضرور ہارون سے بحث کرتیں،اسے اس سمجھوتے اور قربانی والی شادی سے باز رکھنے کی کوشش کرتیں اور اگر وہ ان کی نہیں سنتا تو اس نکاح میں شریک ہونے سے انکار بھی کر دیتیں لیکن وہ یہ سب نہیں کر سکی تھیں کیونکہ وہ خود بھی سر کے احسانات اور ان کیلئے ہارون کے جذبات سے خوب واقف تھیں۔

ہنر راستے میں ہی سو گئی تھی۔اسے کمرے میں بستر پر ڈالنے کے بعد وہ ماموں جان کے بیگز لے کر آیا تھا۔دلہن کا سامان سمجھدار بی بی نے صاحب کے کمرے میں رکھوا دیا تھا۔

''میرے بیگز کہاں ہیں؟''ہارون کے ہاتھ میں صرف ماموں جان کے بیگز دیکھ کر اس نے سوچا۔اس نے ڈفل بیگ کھول کر دوائیاں نکالیں اور ماموں جان کو دوائیاں دیں۔

''اب تم دونوں بھی آرام کرو،تھک گئے ہوں گے۔''انہوں نے پانی کا گلاس اسے واپس پکڑاتے ہوئے کہا۔

''ماموں جان!میں......''

''تم جا کر چینج کرو،میں سر کے سونے تک یہیں ہوں۔''ہارون نے اسکی بات مکمل نہیں ہونے دی۔

''ہاں جاؤ بیٹا۔''ماموں جان نے بھی تائید کی تو اسے اٹھنا پڑا۔وہ کمرے کر باہر نکلی کھڑی سوچ رہی تھی کہ کہاں جائے تبھی ہارون کے لیے کافی لے جاتیں بی بی نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

''وہ والا کمرہ صاحب کا ہے۔''

ڈرائنگ روم سب سے بڑا کمرہ تھا۔اس کے بعد ایک چوڑی اور لمبی راہداری تھی۔جس کے دونوں جانب کمرے تھے۔دائیں طرف کچن اور ایک خالی کمرہ تھا جو اب ماموں جان کا ہو گیا تھا۔بائیں جانب دو کمرے

تھے۔ پہلا حمود کا اور دوسرا ہارون کا۔

اسے آگے بڑھ کر دروازہ کھول کر کمرے میں جانا پڑا کیونکہ بی بی اس کے صحیح کمرے میں جانے کے انتظار میں وہیں کھڑی تھیں۔ دروازے کے پاس ہی اسے اپنا سامان نظر آ گیا۔ پلنگ پر ہنزہ سوئی تھی۔ یہ ماموں جان والے کمرے کی بہ نسبت رقبہ میں بڑا تھا لیکن وہاں موجود سامان اس کی کشادگی کو چھپا رہا تھا۔ الماری، پلنگ، میز اور کرسی کے علاوہ وہاں بڑا سا بک شیلف تھا جو ''کھچا کھچ'' کتابوں سے بھرا تھا۔ پردے، کشن، چادر، درمیان میں بچھا چھوٹا سا رگ اور دیگر فرنیچر سب سفید اور گرے کے مختلف شیڈز میں تھا۔ اس ساری ترتیب میں آنکھوں کو نہ جچنے والی چیز چھت تک جاتی بک شیلف تھی۔

''امریکہ اور آسٹریلیا سے اتنی کتابیں لے کر گھومتے رہے ہیں یا یہ ساری یہاں اکٹھی کی ہیں؟'' اس نے سوچا۔ مختلف جسامت اور مختلف رنگوں کی کتابیں اپنی جائے پناہ میں ٹھنسی کمرے میں بدنما داغ لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے کپڑے نکالے اور دروازہ لاک کر کے وہیں کمرے کی لائٹ بند کر کے کپڑے تبدیل کیے۔ وہ اپنا اتارا ہوا گلابی جوڑا تہہ کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو باہر ہارون تھا۔ وہ بنا کچھ کہے اندر آیا اور بک شیلف سے تلاش کے بعد اردو کی کوئی کتاب نکال کر واپس جانے لگا۔

''آپ یہاں آرام کریں، ماموں جان کے پاس میں رکتی ہوں۔''

وہ دروازے کے وسط میں ذرا دیر کھڑا رہا پھر اس کی طرف مڑا تو چہرے پر واضح جھنجھلاہٹ تھی۔

''ہم دونوں میں سے کوئی بھی آج ان کے پاس نہ رکے تو وہ زیادہ سکون سے سوئیں گے۔'' اس نے جتاتی نظر اس پر ڈالی اور چلا گیا۔

''ہاہ۔'' صوفی اس کی بات کا مطلب سمجھ کر ڈھیلے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ دن بھر کی تھکان کے باوجود بھی اسے اس وقت نیند نہیں آ رہی تھی۔ ذرا دیر بعد وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ وہ اگلے دن کا منصوبہ ترتیب دے رہی تھی۔ ماموں جان کو اسپشلسٹ کے پاس لے جانا ہے، اس کے پہلے اپائنٹمنٹ لینا ہوگا، کیا پتہ اس نے پہلے ہی اپائنٹمنٹ لے رکھا ہو۔ جانے کتنا وقت اسے یوں ٹہلتے ہوئے گزر گیا تھا کہ ہارون واپس آیا۔ اس نے دروازہ کھلا ہی رکھا تھا۔ ہارون نے پلنگ سے تکیہ اٹھایا۔

http://sohnidigest.com

"میں ڈرائنگ روم میں ہوں، دروازہ لاک مت کرنا" اسے دیکھے بنا کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ صوفی نے دروازہ بند کرلیا لیکن حسب ہدایت لاک نہیں کیا تھا۔

لاکھ خواہش کے بعد بھی وہ ماموں جان کے کمرے میں نہیں گئی۔ ہنر بغیر تکیہ کے سوئی تھی۔ اس نے وہ تکیہ اٹھا کر سرہانے رکھا جہاں سے ہارون نے ابھی تکیہ اٹھایا تھا اور سر رکھ کر لیٹ گئی۔ ذرا دیر بعد ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔

✿.....✿.....✿

صبح دور سے آتی اذان کی ہلکی آواز پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے اٹھ کر نماز پڑھی اور پھر ماموں جان کے پاس چلی آئی۔ وہ سو رہے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ انہیں جگائے یا سونے دے۔ سورج نکلنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ وہ وہیں ان کے پائینتی بیٹھ کر اذکار و تسبیحات میں مشغول ہو گئی۔ کچھ دیر بعد ہارون بھی اٹھ کر پہلے انہیں دیکھنے آیا تھا۔ وہاں اسے بیٹھا دیکھ کر وہ آہٹ کیے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ وقت کے بعد عادتاً ماموں جان بھی فجر کی نماز کے لیے جاگ گئے تھے۔

ایک ساتھ ناشتہ کرنے کے بعد ہارون آفس اور بچے اسکول کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ ہارون نے ماموں جان کا شہر کے کامیاب اور معروف ترین آنکولوجسٹ کا اپائنمنٹ لے رکھا تھا جو اگلے دن کا تھا۔

آج اسے معلوم ہوا کہ کل ہی ہارون نے سب کو ولیمہ کی دعوت دے رکھی ہے۔ اسے غصہ آ گیا۔ ان سب چونچلوں کی کیا ضرورت تھی اس وقت۔ جلتے کڑھتے اس نے دوپہر کا کھانا بنایا۔ بی بی کے ہاتھوں کا بنا ناشتہ کرنے کے بعد وہ ماموں جان کو دوبارہ ایسا بے مزہ کھانا نہیں کھلا سکتی تھی۔

دوپہر تک فاطمہ آپا اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ حاضر تھیں۔ وہ اس کیلئے ولیمہ کا نیا ڈریس لائی تھیں۔ صوفی ولیمہ سے ہی خوش نہیں تھی اس پر یہ تیاریاں۔ وہ سارا وقت ماموں جان کے ساتھ ان کے کمرے میں ہی رہی۔ فاطمہ آپا بی بی کے ساتھ مل کر شام کی تیاریوں میں لگی تھیں۔ شام سے پہلے ہی چند لوگ آ کر مختصر سے احاطے میں آنے والے مہمانوں کے لیے میز کرسیاں لگا گئے۔ شام میں مہمانوں کے ساتھ ہی ہارون بھی واپس لوٹا تھا۔ بھیونڈی سے تایا جان کی فیملی، اس کی امی، دونوں بھائی اور زنیرہ آئے تھے۔ پھوپی کی طرف سے کوئی نہیں تھا۔

فاطمہ آپا کی طرف سے کچھ مہمان تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس شادی کی خبر خاندان میں پھیلے لیکن ہارون نے ان دونوں کے خالہ، ماموں اور چاچا کو بھی مدعو کیا تھا۔ سارے مہمانوں کے درمیان بیٹھے قدرے خوش اور مسکراتے ماموں جان کو دیکھ کر اسے سمجھ آیا کہ ہارون نے اس غیر ضروری تقریب کا اہتمام کیوں کیا تھا۔ اس وقت، اس سنت ورسم کی ان دونوں کے نزدیک کوئی معنی نہ ہو لیکن یہ ماموں جان کے اطمینان کے لیے اہم تھی۔

اس کے بعد سارے تکلیف دہ مراحل شروع ہوئے۔ آنکولوجسٹ نے مزید کچھ بلڈ ٹیسٹ اور بائیوپسی کے بعد بچی کچھی امید بھی ختم کر دی۔ کسی اور ملک میں بھی اس قدر ایڈوانس اسٹیج کے لیے کوئی موثر علاج نہیں تھا۔ کیموتھیراپی سے مزید کچھ دن مل سکتے تھے۔ ماموں جان نے خود ڈاکٹر سے ساری باتیں سننے کے بعد کیموتھیراپی اور ہسپتال میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ہسپتال میں مشینوں کے درمیان نہیں بلکہ گھر میں اپنوں کے درمیان آخری سانس لینا چاہتے تھے۔

اس کے نکاح کے ٹھیک ایک ہفتے بعد ہادی چلا آیا۔ دونوں باپ بیٹے بنا کچھ کہے ایک دوسرے کے گلے لگے روتے رہے اور آنکھوں سے آنسوؤں اور دل سے گلے شکوے ایک ساتھ نکلتے گئے۔ معمول کے مطابق مواصلاتی تعلق نہ ہو تو فاصلے لازمی ہیں۔ لیکن اگر محبت قائم ہے تو اسے کھونے کا ہلکا سا خوف بھی پل بھر میں فاصلوں کو بے وقعت کر دیتا ہے۔ ہادی کو احساس تھا کہ اپنی خود ساختہ ناراضی میں اس نے بہت سا قیمتی وقت گنوا دیا ہے لیکن شکر تھا کہ وہ بہت دیر ہونے سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ ماموں جان کے دیے سارے دستاویز اور کاغذات ہارون نے ہادی کے سپرد کر دیے اور اس نے وہ سب صفیہ کے حوالے کر دیئے تھے۔ وہ سایہ بن کر باپ کے ساتھ تھا۔ ان کی خدمت اور گزرے وقت کی تلافی کی خواہش اور وقت کی کمی اس کے پچھتاوؤں میں اضافہ کرتی جا رہی تھی۔ ہادی کی بیوی امید سے تھی اور وہ اسے اپنے باپ سے ملوانا چاہتا تھا۔ اسے اپنے ساتھ لانے کا وعدہ کر کے ایک ہفتہ بعد وہ چلا گیا۔

چند ہفتوں پہلے تک بھلے چنگے انسان کو اپنی آنکھوں کے سامنے دن بدن بلکہ لمحہ بہ لمحہ ختم ہوتے دیکھنا نہایت اذیت ناک عمل ہے۔ ماموں جان ابتدا میں سب کے ساتھ کھانے اور ناشتے کی ٹیبل تک آتے تھے، شام میں حمود اور ہنزہ کا ہاتھ تھامے ان کے ساتھ احاطے میں چہل قدمی کرتے، سب کے ساتھ باہر بیٹھ کر شام کی چائے پیتے

تھے۔ پھران کا چلنا بند ہوگیا، ان سب کاموں کے لیے وہیل چیئر کا سہارا لینا پڑتا۔اس کے بعد ان میں اتنی بھی قوت نہ بچی تھی کہ وہ وہیل چیئر پر بھی بیٹھ سکتے۔ وہ اپنے کمرے اور بستر تک محدود ہو گئے، کھانا، ناشتہ سب کمرے میں ہونے لگا۔ حمود اب بھی کمرے میں انہیں اخبار تو کبھی کوئی کتاب پڑھ کر سناتا۔

پہلے ان کی خوراک کم ہوئی پھر وہ نرم غذا پر آئے، اس کے بعد ان کے لیے چبانا اور نگلنا بھی مشکل ہو گیا تھا، اس لیے صرف سیال غذا پر آ گئے۔ ماموں جان نے فیڈنگ ٹیوب کے لیے بھی انکار کر دیا تھا۔ ہارون نے نرس کا انتظام کیا تھا جو انہیں ڈرپ کے ذریعے آئی وی فلیوڈس اور انجکشن دے جاتی تھی۔

بات اور آواز بھی کم اور کمزور ہوتی گئی۔ اب وہ زیادہ تر اشاروں میں ہی بات کیا کرتے، بولنے سے گریز کرتے۔ وہ ان سب کو دیکھ کر مسکراتے مگر یہ مسکراہٹ صرف لبوں تک محدود رہتی، ان کی آنکھوں میں ہمیشہ پانی ٹھہرا رہتا تھا۔

سارا وقت ان کے ساتھ گزارتے ہوئے اس کے ذہن میں یہی چلتا کہ ابھی ماموں جان کیا سوچ رہے ہوں گے؟ لمحہ لمحہ موت کو قریب آتے دیکھ کر انہیں کیسا لگتا ہوگا؟ کیا وہ خود کو تنہا اور خوفزدہ محسوس کر رہے ہوں گے؟ اسے یہ ساری سوچیں راتوں کو سونے نہیں دیتی لیکن وہ دن بھر ان کے سامنے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کرنے میں ہلکان ہوتی رہتی اور وہ بھی اس کی کوشش محسوس کر کے مسکرانے کی کوشش کرتے رہتے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو حوصلہ دینے کی اپنی سی کوشش میں لگے تھے۔ وہ ان کے قریب بیٹھ کر با آواز تلاوت کرتی اور دعائیں پڑھتی۔ پہلے وہ خود بھی ہلکی آواز میں پڑھتے رہتے تھے لیکن اب وہ بمشکل کچھ بول پاتے تھے۔

"یہ آخری ہے بس۔" اس نے چمچہ ان کے منہ کے قریب لے جا کر کہا۔ انہوں نے انکار میں سر ہلایا ساتھ ہی اپنا کمزور سا ہاتھ اٹھا کر چمچہ دور کرنے کی کوشش کی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے چمچہ واپس سوپ کے پیالے میں رکھا اور ٹشو سے ان کا منہ صاف کیا۔ ماموں جان نے اشارے سے کہا کہ انہیں لیٹنا ہے۔ صوفی نے سوپ کا پیالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اٹھ کر ان کی پشت سے تکیہ ہٹایا اور پھر سہارے سے انہیں لٹا دیا۔ لحاف ان کے سینے تک کھینچ کر وہ ان کے پیروں کے پاس بیٹھ کر پیر سہلانے لگی۔ ہر جگہ آسانی سے میسر انٹرنیٹ اور اس پر موجود معلومات نے آسانیوں کے ساتھ ساتھ دشواریاں

بھی پیدا کر دی تھیں۔ اس نے ضرورت سے زیادہ ہی دیکھ اور پڑھ لیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ ماموں جان کو کہاں کہاں اور کیسی تکلیف ہوتی ہے اور اس پر ان کا صبر اور برداشت اسے مسلسل بھالے کی طرح کھب رہا تھا۔ اب بھی ان کے پیر سہلاتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

ہارون جو دور صوفے پر بیٹھا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا اٹھ کر قریب آیا۔

''میں یہاں ہوں، تم کچھ دیر آرام کر لو۔''

وہ اٹھی نہیں۔

''جاؤ بیٹا، میں سوؤں گا اب۔'' ماموں جان نے نقاہت بھری آواز میں یہ جملہ کہنے کے لیے اپنے نارمل وقت سے تین گنا زیادہ وقت لیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی، انہیں اس قدر بے چینی اور گھبراہٹ رہتی تھی کہ نیند آنا ناممکن تھا۔ دواؤں کے زیر اثر ہی ان کی آنکھیں بند ہوتی تھیں۔ اب ان ادویہ کی مقدار بھی دن بہ دن بڑھانی پڑ رہی تھی۔

''میں تھوڑی دیر بعد آتی ہوں۔'' ماموں جان کی بات وہ ٹالنا نہیں چاہتی تھی اس لیے ہارون سے کہتی کھڑی ہو گئی۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک رات کو ان کے کمرے میں ہی سوتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ہارون اس کی جگہ بیٹھ کر ماموں جان کے پیر ہلکے ہلکے سہلانے لگا۔ ماموں جان نے اسے اشارے سے قریب آنے کو کہا۔ وہ کرسی پلنگ کے قریب لے کر اس پر بیٹھ گیا۔

''ہارون!'' اس نے ان کے قریب جھک کر ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

''صوفی کا خیال رکھنا، تم نے بہت بڑا احسان کیا ہے، اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا، ہمیشہ خوش رہو، آباد رہو۔'' بہت آہستہ اور بڑی کوشش سے انہوں نے اپنی بات کہی تھی۔ ہارون کے لیے انہیں ایسے جدوجہد سے بات کرتے دیکھنا تکلیف دہ تھا لیکن وہ انہیں اپنی بات کہنے سے روکنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

''میں تم سے کوئی وعدہ نہیں لوں گا کیونکہ مجھے تم پر پورا یقین ہے، صوفی کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا، اسے تنہا مت چھوڑنا۔'' وہ رک رک کر بمشکل بول رہے تھے۔

''میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں سر، آپ کی صوفی کا آپ کی طرح ہی خیال رکھوں گا۔'' ہارون کی بات سن کر

ان کے لب مسکراہٹ کے انداز میں پھیلے۔

''شکریہ بیٹا۔ بہت شکریہ۔'' وہ بھی ان کے ہاتھ چوم کر مسکرا دیا۔

اتنی لمبی بات کر کے ان کا سانس پھول گیا تھا، وہ تھک گئے تھے۔ کچھ دواؤں کا بھی اثر تھا کہ ذرا دیر بعد ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

ان کے ہاتھ لحاف کے اندر رکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ پانی پینے کے لیے جگ اٹھایا تو وہ خالی تھا۔ وہ خالی جگ لے کر کچن میں آیا۔ پانی پی کر اور جگ بھر کر واپس کمرے میں جاتے ہوئے وہ ٹھٹک گیا۔ کچن کی طرف رخ ہونے کی وجہ سے جاتے وقت اسے کمرے کے باہر، دروازے کے پاس بیٹھی صوفی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ پیروں کے گرد بازو لپیٹے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے بے آواز رو رہی تھی۔ وہ بنا کچھ کہے اندر بڑھ گیا۔ جگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے پر سکون سوئے سر کو دیکھا تو ذہن ذرا دیر پہلے والی گفتگو دہرانے لگا۔ وہ واپس باہر آیا۔

''اٹھو۔'' اس کی آواز دھیمی اور نرم مگر انداز تحکم بھرا تھا۔ صوفی نے جیسے سنا ہی نہیں۔

''صوفی!'' وہ اب بھی یوں ہی بیٹھی رہی۔ ہارون نے جھک کر اس کا بازو پکڑ کر اسے کھڑا کیا اور تقریباً گھسیٹتا اپنے کمرے میں پہنچا۔

''اگر سر کی نظر تم پر پڑ جاتی تو؟'' وہ کمرے کے باہر جہاں بیٹھی تھی ممکن تھا کہ اپنے پلنگ سے ماموں جان اسے دیکھ لیتے۔ وہ جو بے آواز رو رہی تھی منہ ڈھانپ کر اور شدت سے رونے لگی۔ اپنی مصروف زندگی میں وہ اسے چلتے پھرتے کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا لیکن اس وقت ملگجے، سلوٹ زدہ کپڑے اور بکھرے بالوں میں اسے روتے دیکھ کر اسے اپنا صوفی کو یوں نظر انداز کرنا غلط لگا۔ وہ ماں باپ کے بعد بچا اپنا واحد عزیز رشتہ گنوانے جا رہی تھی۔ خود اس کے لئے دن بہ دن تنزل ہوتی طبیعت اور صحت کے ساتھ عبدالحمید سر کو دیکھنا بہت اذیت ناک تھا تو اس کے لئے تو یہ الم عظیم تھا۔ اسے اپنی کوتاہی کا احساس ہوا۔ اس نے ابھی ابھی وعدہ کیا تھا، عبدالحمید سر کی طرح اس کا خیال رکھنے کا۔

''ہمت رکھو۔'' ہارون نے کہا ہی تھا کہ وہ اور تیزی سے رونے لگی۔

''صبر کرو صوفی۔'' ہارون نے دلاسہ دیتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”نہیں ہے مجھ میں ہمت، نہیں ہوتا مجھ سے صبر۔“ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر بڑی لجاحت سے کہا۔

”اگر میں روؤں بھی نا تو میرا دل پھٹ جائے گا۔“

اس لمحے صوفی کا درد ہارون کو اپنے دل میں محسوس ہوا۔ وہ بے اختیار آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ صوفی کے سر سے پھسل کر اس کے شانے اور پھر اس کی پشت پر پھیل گیا۔ اسے سہارا ملنے کی دیر تھی، وہ ٹوٹ کر رونے لگی۔ ہارون نے اسے رونے دیا۔ جانے کتنی دیر بعد وہ خود ہی سنبھل کر چپ ہو گئی۔ اس کی ٹانگوں میں جان نہیں بچی تھی جن کی لرزش ہارون کو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے لگا اس نے اپنا بازو ہٹایا تو وہ گر جائے گی۔ ہارون نے اسے دونوں کاندھوں سے پکڑ کر خود سے الگ کیا۔

”تم سو جاؤ، میں ہوں سر کے پاس۔“ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ کچھ کہتی اس سے پہلے ہی ہارون بول پڑا۔

”اس طرح تم بیمار پڑ جاؤ گی، آرام کرو۔“

وہ باہر نکل گیا۔ صوفی نے مڑ کر سوئی منزر کو دیکھا۔ جس رات ہارون ماموں جان کے کمرے میں رکتا تھا اسے اسی کمرے میں سونا پڑتا۔ وہ پلنگ کے کنارے ٹک گئی۔ اسے خود ہوش نہیں تھا کہ پچھلے کئی دنوں سے وہ کب اور کیا کھا رہی تھی، کب سو رہی تھی، آخری بار کپڑے کب تبدیل کیے تھے۔ وہ یونہی بیٹھی تھی کہ دستک دے کر ہارون اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا مگ تھا۔

”یہ پی لینا۔“ اس نے مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور چلا گیا۔ بھاپ اڑاتے مگ میں انرجی ڈرنک ملا دودھ تھا۔ وہ مگ کو دیکھتی رہی۔

”مجھے بیمار نہیں پڑنا۔“ کچھ دیر بعد اس نے مگ اٹھا لیا۔

❁......❁......❁

یہ ہی ماموں جان کی آخری باتیں ثابت ہوئیں۔ اس کے بعد انہوں نے بات بالکل بند کر دی تھی۔ ہارون نے ہادی کو فون کر کے ان کی گرتی حالت کی خبر کر دی۔ وہ جو اپنی بیوی کو لینے کے لیے گیا تھا، اس کی پریگنینسی کے کمپلیکیشنز کی وجہ سے خود بھی ابھی تک نہیں آ پایا تھا۔ بات بند کرنے کے تین دن بعد ماموں جان کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔ اسی دن ہادی بھی پہنچ گیا۔ بس سانسیں چل رہی تھیں۔ بند آنکھوں کے ساتھ ہی انہوں نے دو دن

سب کے ساتھ گزارے اور پھر زندگی کی یہ نشانی بھی خاموش ہوگئی۔

ماموں جان کی تدفین کے بعد اس کی امی تین دن اس کے پاس رکی رہیں۔ ان کے جانے کے دوسرے دن فاطمہ آپا بھی چلی گئیں۔ اس نے ماموں جان کا کمرہ سنبھال لیا تھا۔ ضروری کاموں کے علاوہ وہ تلاوت کرتی یا پھر سوتی رہتی۔ اسے بہت نیند آنے لگی تھی۔ وہ اوڑھ لپیٹ کر ماموں جان کے بستر میں پڑی رہتی۔ کئی کئی دنوں تک وہ کمرے کے باہر بھی نہیں نکلتی تھی۔ ہنزا اسے ڈھونڈتی اس کے پاس آتی لیکن اس کی خاموشی، عدم دلچسپی اور ہوں، ہاں سے اکتا کر چلی جاتی۔

کسی کو کھو کر یا کسی سے بچھڑ کر درد سے تڑپنا، رونا، سسکنا، اپنے خسارے اور غم سے باہر نکلنے کا بڑا دردناک راستہ ہے لیکن اس آہ و بکا اور چیخ و پکار کے بعد ہی آگے بڑھنا ممکن ہوتا ہے۔ دوسرا راستہ بڑی گہری تاریکی سے گزرتا ہے۔ جہاں صرف خالی پن اور سناٹے ہوتے ہیں۔ نہ دل میں درد اٹھتا ہے نہ آنکھوں میں آنسو مچلتے ہیں، کوئی بے کلی نہیں کوئی بے قراری نہیں۔ ہر سو خاموشی ہوتی ہے۔ درد کی یہ صورت ہر احساس چھین لیتی ہے، یہ آخری حد تہی دامن کر دیتی ہے۔ یہ منجمد کیفیت آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ دل، زندگی اور اس سے جڑا سب کچھ ٹھہر جاتا ہے۔ وہ اسی دوسرے راستے پر تھی۔

ماموں جان کے انتقال سے پہلے ہی ہنزا اور حمود کے اسکول کی چھٹیاں چل رہی تھیں لیکن وہ سمر کیمپ، مختلف کلاسز اور ورکشاپس کی وجہ سے اسکول کے دنوں سے زیادہ مصروف تھے۔ کچھ ماموں جان کی گرتی طبیعت اور گھر کے سوگوار اور بوجھل ماحول سے انہیں دور رکھنے کے لیے ہارون نے دانستہ بچوں کو مصروف تر کر دیا تھا۔

رات وہ ہنزا اور حمود کے ساتھ تھا تب ہنزا نے پوچھا۔

''پاپا! صوفی بات کیوں نہیں کرتی ہیں؟''

''صوفی بات نہیں کرتی؟'' اس نے حیرت سے وہی سوال دہرایا۔

''ہاں، وہ دن بھر دادا جان کے کمرے میں رہتی ہیں، باہر بھی نہیں آتیں۔''

''اچھا۔'' ہارون نے حمود کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی تائید میں سر ہلایا۔

وہ بہت مصروف ہوگیا تھا۔ اس کا کام وقت اور توجہ طلب تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ ٹھیک طرح سے وقت

نہیں دے پایا تھا۔اس کی تلافی کے لیے آج کل وہ لیٹ گھر آنے لگا تھا۔ہنر کی بات پر اسے بھی خیال آیا کہ کئی دنوں سے اس نے صوفی کو دیکھا نہیں ہے۔اس دوران اس نے بی بی سے کئی بار اس کا حال پوچھا تھا۔

''صوفی کیسی ہے؟''اور اس تین لفظی سوال کے جواب میں بی بی شاید صوفی کے متعلق اپنی رائے دیتی تھیں۔''ٹھیک ہے۔''

اور وہ بھی اس دو لفظی مبہم سے جواب کو''سب ٹھیک ہے۔''مان کر مطمئن تھا۔

ہارون نے اندر جھانکا۔وہ پلنگ پر گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی تھی۔وہ اندر چلا آیا۔آہٹ پر بھی صوفی نے سر نہیں اٹھایا تھا۔وہ سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''مجھے ابھی ہنر نے بتایا کہ تم دن بھر کمرے میں رہتی ہوں۔''اسے یوں ہی چپ دیکھ کر بڑی دیر بعد ہارون نے کہا۔''باہر نکلا کرو، خود کو مصروف کرو، کہیں جانا چاہتی ہو تو گھر میں گاڑی اور ڈرائیور ہوتا ہے، اپنی دوستوں کو گھر بلانا چاہو تو بلاؤ، بھیونڈی جانا چاہتی ہو تو وہاں بھی جا سکتی ہو۔''ہارون اسے دیکھتے ہوئے بول رہا تھا لیکن اسے شبہ تھا کہ وہ سن بھی رہی ہے یا نہیں۔

''جانے والوں کے ساتھ ہماری زندگی ختم نہیں ہوتی ہے۔''ایسے موقعوں پر کہا جانے والا یہ گھسا پٹا جملہ کہتے ہوئے اس جملے کے برحق ہونے کی حقیقت ہارون سے بہتر کون جان سکتا تھا۔

''اور زندگی ہے تو اس کے تقاضے بھی پورے کرنے ہوتے ہیں۔یوں سب سے منہ موڑ کر اور ناراض ہو کر تم خود کو مزید دکھی کر رہی ہو۔''اس کے وجود میں ہلکی سی جنبش نہیں ہوئی تھی کجا کہ وہ کچھ جواب دیتی۔ہارون گہری سانس لے کر چپ ہو گیا۔کتنا ہی وقت گزر گیا کہ دفعتاً اس کی آواز ابھری۔

''میں نے اپنی زندگی کا سب سے زیادہ حصہ ماموں جان کے ساتھ گزارا ہے۔''وہ اسی طرح پیروں کے گرد بازو لپیٹے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے بول رہی تھی۔''لیکن اب مجھے اتنے سارے سالوں کا ایک لمحہ یاد نہیں آتا، صرف ان کا آخری وقت یاد آتا ہے، میں ان کی باتیں یاد کرنا چاہتی ہوں تو انکی دشواری سے دھیرے دھیرے کی گئی باتیں میرے ذہن میں ابھرتی ہیں، ان کیساتھ کا ہنسی مذاق اور اچھا وقت یاد کرنا چاہتی ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے سہارے سے چلتے یا وہیل چیئر پر بیٹھے ماموں جان آتے ہیں، میرے اپنے گھر میں ماموں جان کے

ساتھ بتایا ہر لمحہ میری یادداشت سے گم ہو گیا ہے اور اس کی جگہ اس گھر کے چند دنوں نے لے لی ہے۔" اس کی نظر فرش پر تھی اور ہارون کی نگاہ اس پر۔

"میں کیا کروں مجھے کچھ نہیں سوجھتا، مجھے صرف ماموں جان کی یاد آتی ہے۔" اس کے آنسو بہنے لگے۔

"اتنی یاد آتی ہے کہ لگتا ہے یہ میری جان لے لے گی لیکن یادیں اتنی رحم دل کہاں ہوتی ہیں۔" اس کا آخری فقرہ ہارون کے دل پر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔

"اگر ماموں جان کو پتہ ہوتا کہ میں ان کے بعد ایسے اپاہج ہو جاؤں گی تو وہ مجھے چھوڑ کر نہ جاتے۔ یا شاید انہیں مجھ پر اتنا اعتماد تھا کہ میں خود کو سنبھال لوں گی، ان کے بغیر بھی ان کے ساتھ جیسی زندگی گزاروں گی اس لیے وہ چلے گئے ہیں۔" اس نے سیدھے ہو کر چہرہ صاف کیا۔

"میں کس سے ناراض ہو سکتی ہوں؟ کون ہے جس سے منہ موڑوں؟" وہ اب بھی ہارون کی جانب نہیں دیکھ رہی تھی۔ "زندگی کا سب سے بڑا تقاضہ سانس لینا ہے، وہ تو میں پورا کر رہی ہوں۔" اس نے انگلیوں پر گننا شروع کیا۔ "کھاتی ہوں، سوتی ہوں، نہاتی ہوں، کپڑے بدلتی ہوں، نماز پڑھتی ہوں، قرآن بھی...... اور کیا بچا ہے۔" اس نے گننا بند کر کے گردن موڑ کر تکیے کو دیکھا اور کچھ دیر چپ رہی۔

"کتنی باتیں یاد آتی ہیں جو مجھے ماموں جان سے کہنا تھیں۔ سب کہتے تھے انہوں نے مجھے باپ کی طرح پالا ہے لیکن مجھے یہ کبھی اچھا نہیں لگا، کیوں لازوال اور غیر مشروط محبت کے لیے والدین کا حوالہ دینا ضروری ہے؟ ماموں جان نے باپ نہ ہو کر بھی مجھے ایسی ہی محبت دی تھی، پھر کیوں باپ جیسا کہہ کر ان کا مقام چھوٹا کروں، وہ دنیا کے سب سے اچھے ماموں جان تھے سب سے اچھے۔ مجھے یہ ان سے کہنا تھا۔" وہ رونے لگی تھی۔

"مجھے ان کی کمی لگتی ہے، میرا دل انہیں دیکھنے اور چھونے کی خواہش کرتا ہے، اس کے بعد یہ خیال آتا ہے کہ اب یہ کبھی ممکن نہیں۔ میں کیسے جیوں ان کے بغیر۔ کیسے سیکھوں ان کے بغیر جینا۔"

وہ مڑے ہوئے پیروں کے ساتھ ہی تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ جہاں ماموں جان نے اپنی آخری سانس لی تھی۔ کمرے میں اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ ہارون نے تھکے تھکے انداز میں صوفے کی پشت پر سر ٹیک دیا۔ وہ رونے پر قادر تھی سو رو رہی تھی اور وہ ساتھ دینے کے وعدے کا پابند سو وہیں بیٹھا رہا۔ دھیرے دھیرے اس کی

سسکیوں کی آواز بند ہوگئی۔ ہارون نے سامنے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا، دو بج گئے تھے۔ وہ صوفے سے کھڑا ہوا اور ذرا چل کر پلنگ کے قریب آیا۔ صوفی روتے روتے اسی پوزیشن میں سوگئی تھی۔

صبح اس کی اپنے وقت پر آنکھ کھلی تھی۔ وہ اپنے اوپر کی چادر ہٹا کر اٹھ بیٹھی۔ سامنے صوفے کے دستے پر سر رکھے، سینے پر ہاتھ باندھے ہارون سو رہا تھا۔ وہ ساکت بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ اسے پچھلی رات یاد آگئی تھی۔ پھر وہ آہستہ سے اٹھی اور احتیاط سے چادر ہارون کے اوپر ڈال کر باہر نکل گئی۔ ڈرائنگ روم میں نماز پڑھنے کے بعد وہ قرآن لے کر باہر آگئی تھی۔

ہارون جاگا تو اپنے اوپر پڑی چادر دیکھ کر اس نے فوراً پلنگ کی سمت دیکھا کہ اس نے رات میں یہی چادر صوفی کے اوپر ڈالی تھی۔ خالی پلنگ دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ چادر تہہ کرتے ہوئے کھڑکی کے باہر نظر گئی تو وہاں صوفی ہل ہل کر تلاوت کر رہی تھی۔ وہ مطمئن سا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہ ناشتے سے فارغ ہو کر کرسی سے اٹھا ہی تھا کہ صوفی کچن میں داخل ہوئی۔

''صوفی!'' ہمنر اپنی کرسی چھوڑ کر اس کے پاس بھاگی۔ صوفی نے مسکراتے ہوئے اس کے گال چھوئے۔

''ہمارے ساتھ بریک فاسٹ کریں۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ٹیبل تک لائی۔ ہارون کچھ کہے بنا ہی باہر نکل گیا۔ صوفی کرسی پر بیٹھی تو حمود نے اسے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' وہ اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر خفیف سا مسکرائی۔

''اسٹارٹ میں ڈفیکلٹ لگتا ہے، لیکن پھر عادت ہو جاتی ہے۔'' وہ بری طرح چونکی۔ اسے حمود سے اس قسم کی بات کی قطعی امید نہیں تھی۔ وہ لاکھ سلجھا اور اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار سہی لیکن تھا تو بچہ ہی۔ مانا کہ اس نے کم عمری میں ماں کے جانے کا دکھ سہا تھا لیکن بچپن میں ماں باپ تو اس نے بھی کھوئے تھے پھر بھی حمود اتنی عمر میں اس قسم کی باتیں نہیں کرتی تھی۔

''کیا ہوا؟'' اسے یوں مبہوت دیکھ کر حمود نے پوچھا۔ ''آپ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟''

''آپ بہت بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں، ایسی باتیں جو بچوں سے ایکسپیکٹڈ نہیں ہوتیں۔''

''یہ کامپلیمنٹ ہے یا کمنٹ؟''

''یہ تو میں بھی نہیں جانتی۔'' وہ پھر مسکرائی۔

اسی وقت بی بی نے ان دونوں کے ٹفن باکس ٹیبل پر رکھے۔

''آج کیا ہے ٹفن میں؟''

''جیم بریڈ۔'' بی بی کا جواب سن کر ہنر نے کچھ کہا نہیں لیکن اس کا منہ بن گیا تھا۔

''کیوں، آپ کو پسند نہیں؟''

ہنر نے نفی میں سر ہلایا۔

''چلو آپ کو کچھ اور بنا کر دیتے ہیں۔'' وہ کرسی کھسکا کر کھڑی ہوئی۔

''اس وقت کوئی سبزی ہے گھر میں نہ گوشت۔'' بی بی نے اس کے آگے چائے، بریڈ اور آملیٹ رکھتے ہوئے کہا۔

''بریڈ، انڈے اور آٹا تو ہیں نا؟''

''ہاں، یہ سب ہیں۔''

''ہنر کو فرینچ ٹوسٹ چاہیے یا ایگ پراٹھا؟''

''ایگ پراٹھا۔'' ہنر نے خوشی خوشی جواب دیا۔

صوفی اپنا ناشتہ چھوڑ کر کچن کاؤنٹر کی طرف بڑھی۔ حمود نے خاموشی سے اپنا ٹفن اٹھایا اور کچن سے نکل گیا۔

حمود کی بات درست تھی۔ اپنے قریبی اور عزیز کی غیر موجودگی سے پیدا ہوئے خلاء کو قبول کرنا مشکل اور وقت طلب عمل ہے۔ ایک بار اسے قبول کرلیں تو پھر اس خلاء کے ساتھ جینا بھی آ ہی جاتا ہے۔ جیسے نئی نئی چوٹ تکلیف زیادہ دیتی ہے لیکن وقت کے ساتھ اس کی عادت ہو جاتی ہے۔

اس نے گھر پر توجہ دی تو پتہ چلا کہ حمود اور ہنر ڈرائیور کے ساتھ صبح ایک ساتھ جاتے تھے لیکن واپسی کے اوقات مختلف تھے۔ ہنر کی چھٹی پہلے ہوتی تھی۔ اسے لینے کے لئے ڈرائیور کے ساتھ بی بی جاتی تھیں۔ آگے پیچھے اسکول سے واپسی کے بعد وہ دونوں پھر دیگر کلاسز کے لیے جاتے تھے۔ ہنر ہفتے میں تین دن آرٹ کلاس کو جاتی تھی جبکہ حمود روزانہ میتھس کلاس اور فٹ بال کوچنگ سے شام میں واپس آتا تھا۔ اس کے علاوہ حافظ صاحب

روز عربی پڑھانے آتے تھے۔

بی بی کا نام ہی بی بی تھا، یہ ان کا نک نیم یا پیٹ نیم نہیں تھا۔ وہ فاطمہ آپا کے توسط سے اس گھر میں تھیں۔ وہ صبح سات بجے آتی تھیں اور رات میں ہارون کے آنے کے بعد ڈرائیور انہیں ان کے گھر چھوڑنے جاتا تھا۔

اس نے سب سے پہلے کھانا پکانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ بی بی بس پکانے کی ذمہ داری پوری کرتی تھیں۔ پکانے میں سلیقہ تھا نہ کھانے میں ذائقہ۔ اسے سچ میں ان تینوں پر رحم آتا تھا جو سال بھر سے ان کے ہاتھ کا بنا کھانا کھا رہے تھے۔ اسے ماموں جان کی بات یاد آئی کہ بے چارہ نوکروں کے ہاتھ کا کھانا کھاتا ہے اور پہلی بار اسے شک ہوا کہ ہارون کا ہر ہفتہ چکر ماموں جان سے ملاقات کے ساتھ ساتھ اچھے کھانے کی لالچ میں بھی ہوتا ہوگا۔ اس معاملے میں وہ واقعی بے چارہ تھا۔ ہنزہ اور حمود ذائقے دار کھانا ملنے پر خوش تھے تو بی بی کچن سے چھٹکارہ ملنے پر۔ ہارون کے رویے سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اسے اس تبدیلی سے خوشی ہوئی ہے یا نہیں۔

بی بی نے ہی بتایا تھا کہ ہارون گھر سے کھانا نہیں لے جاتا ہے۔ آج اس نے ہنزہ اور حمود کے ساتھ ساتھ اس کا بھی ٹفن تیار کیا تھا۔

اس کی دستک پر اندر سے ہارون کا ''ہمم'' سن کر وہ اندر داخل ہوئی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا۔

''آپ کا لنچ۔'' اس نے آگے بڑھ کر ڈبہ میز پر رکھ دیا۔

''میں ٹفن نہیں لیتا ہوں۔'' وہ اب بھی آئینے کی سمت رخ کیے کھڑا تھا۔

''اب سے لے جائیں۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

''ایک منٹ۔'' وہ اس کی طرف مڑا۔ وہ رک گئی۔

''یہ تمہارا گھر ہے، یہاں تمہیں جو کرنا ہے کرو، جیسے رہنا ہے رہو، کوئی بندش نہیں ہے، تم آزاد ہو لیکن تمہیں میری زندگی میں دخل اور میری ذات میں دلچسپی لینے کی اجازت نہیں ہے۔''

اس باقاعدہ بے عزتی پر صوفی کا چہرہ تمتمانے لگا۔

''روتے کو کاندھا دینا انسانی فرض ہے، اسے اپنی مرضی کے معنی دینے کی کوشش نہ کرو۔''

کاش وہ پہلی بات کے بعد ہی رک جاتا یا وہ اتنا ہی سن کر وہاں سے بھاگ نکلتی۔ صوفی کو لگا اس کے چہرے

پر جمع ہوا سارے بدن کا خون ابھی پھوارے کی شکل میں اس کے چہرے سے پھوٹ پڑے گا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ ایک کی نگاہ برف سی سرد تھی اور دوسرے کی شرارے اگل رہی تھی۔ صوفی نے میز سے ڈبہ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ ہارون کی آنکھوں کی برف فوراً پگھلی تھی۔

''یہ ضروری تھا۔'' اس نے گہری سانس لے کر خود کو یقین دلایا۔

کچن میں آ کر اس نے بھنڈی کڑاھی میں واپس ڈالی، روٹی نکال کر ہاٹ پاٹ میں رکھی اور ڈبہ دھو کر کاؤنٹر پر پٹخا۔

''یعنی حد ہے۔'' وہ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر زوردار آواز کے ساتھ بیٹھی۔ ''انسانیت چھو کر نہیں گزری اور انسانی فرض۔ ہونہہ۔'' ہارون کے لئے غائب ہوئے اس کے ابتدائی جذبات اور خیالات ایک بار پھر پورے ٹھاٹ سے اس کے سامنے اکڑ کر کھڑے تھے۔

''میں کیوں چپ چاپ چلی آئی؟ میں بھی تو کہہ سکتی تھی کسی کے کھانے کی فکر کرنا بھی انسانی فرض ہے اسے اپنی مرضی کے معنی دینے کی کوشش نہ کریں۔ دھت۔''

''کیا ہوا؟'' بی بی نے اسے ہونٹ کاٹتے، چہرے کے خطرناک اثرات کے ساتھ بیٹھے دیکھا تو پوچھا۔ وہ ان کے سامنے ڈبہ کر کے کچن سے نکلی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے زوردار آواز کے ساتھ کرسی پیچھے کھسکائی اور کچن سے نکل گئی۔ بی بی نے چاروں طرف نظر گھمائی تو سامنے ٹیبل پر رکھا دھلا لنچ باکس نظر آ گیا جو وہ ذرا دیر پہلے لے کر گئی تھی۔

ان دونوں کے درمیان ایک بار پھر پہلے والی سرد مہری کی دیوار تن گئی۔ اس کے بعد صوفی نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی اور ہارون بھی اسے مکمل نظر انداز کر رہا تھا۔ ویسے بھی وہ مصروف ترین آدمی تھا۔ صبح کا جاتا رات میں گھر آتا اور پھر کتابوں میں گم۔ رات کے کھانے پر بچوں سے باتیں کرتا دن بھر کا احوال اور اسکول و پڑھائی کے متعلق پوچھتا۔ وہ بچوں کی ہر بات سے باخبر رہتا تھا۔ چھٹی کے دو دن وہ گھر پر ہی گزارتا تھا اور ہفتے کے یہ دن اس کے لیے امتحان ہوتے تھے۔ حمود بھی باپ کی طرح کتابی کیڑا تھا۔ اس کے کمرے میں رکھی کتابوں کے عنوان دیکھ کر ہی وہ چکرا گئی تھی۔ ایسٹروناٹ بننا اس کا خواب تھا اور اس کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ اکثر دونوں باپ

بیٹے لمبی چوڑی ''انٹلیکچوئل'' گفتگو شروع کر دیتے اور ایسے اوقات میں صوفی کو اپنا آپ جاہل گنوار دیہاتن لگتا۔ ہنزہ کو کتابوں سے زیادہ آرٹ کرافٹ میں دلچسپی تھی۔ اس عمر سے ہی اسے رنگوں کی بڑی اچھی سمجھ تھی۔ کس رنگ کے ساتھ کونسا امتزاج اور کون سا شیڈ درست رہے گا، وہ اس طرح بتاتی تھی کہ نتیجہ دیکھ کر صوفی بھی حیران رہ جاتی۔ اس کا پسندیدہ مشغلہ یوٹیوب پر آرٹ اور کرافٹ کی ڈی آئی وائی ویڈیوز دیکھنا اور انہیں خود ٹرائے کرنا تھا۔

✿......✿......✿

آج چھٹی کا دن تھا اور باپ بیٹا پھر اسے احساس کمتری میں مبتلا کرنے پر کمربستہ تھے۔ برا ہوا کہ آج ہنزہ کو بھی ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھنا تھا۔ وہ اپنی ٹیچر کے لیے تھینک یو کارڈ بنا رہی تھی اور اس کی سجاوٹ کے لیے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے گلاب کے پھول بن رہے تھے۔ بی بی بڑے دنوں بعد ہفتہ بھر کی چھٹی لے کر اپنے بیٹے کے گھر گئی تھیں۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھ کر ہنزہ سے کہا۔

''کھانے کا وقت ہو گیا ہے بیٹا، ڈیکوریشن کے لیے اتنے فلاورز کافی ہیں۔'' اس نے تیزی سے پھیلاوا سمیٹنا شروع کیا۔

''اوکے۔'' وہ بڑی آسان بچی تھی۔ صوفی نے ابھی تک اسے کبھی ضد یا ہنگامہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔

''آپ یہ دو تین فلاورز بناؤ تب تک میں کھانا لگاتی ہوں۔'' اس نے سارا سامان آرٹ اینڈ کرافٹ کے مخصوص ڈبے میں ڈال کر دو تین پٹیاں ہنزہ کے آگے کیں۔

کچن میں آ کر اس نے کھانا گرم کر کے میز پر لگایا اور واپس ڈرائنگ روم میں آئی تو ہارون اور حمود کی ''مغز پاشی'' جاری تھی۔

''دیکھیں۔'' ہنزہ نے اپنے بنائے پھول اس کے سامنے کیے۔

''ویری گڈ۔'' اس نے واقعی اچھے بنائے تھے۔

''میں یہ سب کمرے میں رکھ کر آتی ہوں، تب تک آپ پاپا اور بھائی کو لے کر کچن میں آ جاؤ۔'' تازہ تازہ بنے پھول اور بقیہ کاغذ اٹھا کر اس نے آہستہ سے ہنزہ کو سمجھایا اور ایک بار پھر سب اٹھا کر باہر نکل گئی۔

یوں تو ہنزہ کے کپڑے جوتے اور دیگر سامان ہارون کے کمرے میں رہتا تھا لیکن دھیرے دھیرے کافی چیزیں ادھر سے صوفی کے کمرے میں منتقل ہوگئی تھی۔ پہلے ہارون کی مدد سے وہ خود اسکول کی تیاری کیا کرتی تھی۔ جب صوفی نے اسے تیار کرنا شروع کیا تو پہلے اس کا یونیفارم اور بیگ ادھر آیا پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ اب وہ صرف سوتی ہارون کے کمرے میں تھی اور سامان تقریباً صوفی کے کمرے میں تھا۔ کھانا لگانے اور کھانے کے لیے بلانے کا کام بی بی کیا کرتی تھیں۔ ان کی غیر موجودگی میں یہ پہلا موقع تھا۔

وہ کچن میں آئی تو وہ تینوں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اس نے بھی اپنی کرسی سنبھال لی۔ ہارون نے پہلے کھانا ہنزہ کی پلیٹ میں نکالا پھر اپنے لیے۔ وہ تینوں کھانا شروع کر چکے تھے لیکن ہنزہ یوں ہی بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا؟" ہارون نے انگریزی میں پوچھا۔ "آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟"

"پاپا! صوفی اور آپ ایک دوسرے سے بات کیوں نہیں کرتے ہیں؟" اس نے بھی اسی زبان میں پوچھا۔ اس اچانک سوال پر وہ دونوں چونک کر تھم گئے۔ چند لمحوں بعد ہارون نے آہستہ سے نوالہ پلیٹ میں واپس رکھا اور اس نے منہ میں۔ حمود اپنی پلیٹ پر جھکا کھانے میں یوں مشغول تھا جیسے آس پاس سے کوئی سروکار نہ ہو۔

"ایسا تو نہیں ہے بیٹا۔" ہارون نے سنبھل کر بیٹی کو دیکھا۔

"جھوٹا انسان۔" صوفی نے دل میں کہا۔

"ہم کرتے ہیں بات ایک دوسرے سے۔" اتنا سا جملہ بھی اس نے رک رک کر پورا کیا تھا۔ ہنزہ کو اپنی بات سے قائل نہ دیکھ کر اس نے صوفی کو مخاطب کیا۔ "کیوں صوفی۔؟"

"آں، ہاں، ہم بات کرتے ہیں، کیوں آپ نے نہیں دیکھا؟" اگلے پل وہ بھی جھوٹوں میں شامل ہوگئی۔

ہنزہ نے ہونٹ لٹکا کر نفی میں سر ہلایا۔

"تو بیٹا آپ نے دیکھا نہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم بات نہیں کرتے ہیں۔" صوفی نے اس کے بال بگاڑے۔

"اب خیال رکھیں گے کہ آپ کے سامنے بھی ہم بات کریں۔" ہارون نے خوش دلی سے کہتے ہوئے ماحول ہلکا کرنا چاہا۔

''چلو اب کھانا اسٹارٹ کرو۔'' ہنزہ نے مسکرا کر کھانا شروع کر دیا۔

''آپ کے بال بہت بڑے ہو گئے ہیں۔'' ہارون نے موضوع بدلا۔ ''کل آپ صوفی کے ساتھ جا کر ہیر کٹ کروا لینا۔''

''نہیں پاپا، مجھے ہیر کٹ نہیں کروانا۔'' اس نے انگریزی میں حتمی انداز میں کہا۔ ''مجھے لمبے بال پسند ہیں اور اب صوفی میری پونی بناتی ہے۔'' چوٹی اور پونی نہ بنانی پڑے اسی لئے اس کے بال بلنٹ کٹ رکھے جاتے تھے۔

''او کے۔'' اس نے مسکرا کر بیٹی کی خواہش مان لی۔

''بی بی کب آئیں گی؟'' ہارون نے پوچھا۔

''آج ہی تو گئی ہیں، ایک ہفتے کا کہا ہے۔'' وہ بیٹی کے سامنے بن رہا تھا تو اس کے بننے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

''تمہیں ہیلپر کی ضرورت پڑے گی میں کل ہی ڈرائیور......''

''نہیں۔'' صوفی نے بات کاٹی۔ ''مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔''

ہارون نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

''پاپا! آج میں صوفی کے پاس سو جاؤں؟'' اچانک ہنزہ نے پوچھا۔ اسے کارڈ مکمل کرنا تھا جو ہارون کے ساتھ کمرے میں جا کر ممکن نہیں تھا۔ ہارون نے صوفی کو دیکھا۔ وہ اس کی نظریں محسوس کر کے بھی انجان بنی رہی۔ اسے ہنزہ کے صوفی کے ساتھ سونے پر اعتراض تھا لیکن صوفی کے جان بوجھ کر لاتعلقی کے اس اظہار پر وہ رک گیا۔

''ہمم۔'' ہارون نے ہنزہ کو دیکھ کر کہا۔

''تھینک یو پاپا۔''

حمود کھڑا ہو گیا۔

''اتنی جلدی؟'' صوفی نے پوچھا۔

''آج زیادہ بھوک نہیں لگی تھی۔ پاپا باقی ڈسکشن نیکسٹ سنڈے کریں گے، ابھی نیند آ رہی ہے۔''

''اوکے۔لیکن آپ کھانے کے فوراً بعد سو جائیں گے؟''

''میں بک پڑھتے ہوئے کمرے میں کچھ دیر واکنگ کرلوں گا۔''

وہ چلا گیا۔اس کے بعد ہارون بھی۔ ہنزا اس کے کچن سمیٹنے اور برتن دھونے تک اس کیساتھ رہی پھر وہ دونوں اس کے کمرے میں آ کر ادھورا کارڈ مکمل کرنے کے بعد سوئے تھے۔

بی بی نہیں تھیں تو اگلے دن ہنزا کو لینے کے لئے اسے اسکول جانا پڑا۔اسے کار کے باہر کھڑے دیکھ کر ہنزا عادتاً بھاگ کر اس کے پیروں سے لپٹ گئی تھی۔

''روز آپ ہی آیا کریں۔''اس کے ساتھ کار میں بیٹھتے ہوئے ہنزا نے کہا۔

''اچھا۔''

اسے بھی آج احساس ہوا تھا کہ وہ کتنے مہینوں سے گھر میں بند ہے۔ اتنے لمبے وقفے کے بعد باہر کی افراتفری اور شور اسے نیا لگ رہا تھا۔وہ خوشگوار موڈ کے ساتھ گھر لوٹی تو فاطمہ آپا اپنی چھوٹی بیٹی زوبیہ کے ساتھ موجود تھیں۔ بارہ سال کی زوبیہ بہت باتونی اور چلتا پرزہ قسم کی لڑکی تھی۔وہ واحد ہستی تھی جو اسے مامی پکار کر اس کے نئے رشتے اور گھر میں اس کی حیثیت کا احساس دلاتی تھی۔ بیٹی کے برعکس فاطمہ آپا خود کی اس گھر میں اہمیت اور اپنے نند ہونے کا احساس کرانے یا پھر ڈرانے کے لئے ضرورت سے زیادہ استحقاق کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ جس میں ہر کمرے کا بلا جھجک دورہ، کچن میں چیزوں کی اٹھا پٹخ، ڈرائیور اور واچ مین کو زبردستی کی ڈانٹ، آج تو بی بی نہیں تھیں ورنہ ان سے بھی سارا حساب کتاب لیا جانا شامل تھا۔

حمود اپنی کلاس کے لیے گیا تھا اور شام میں ہنزا اور زوبیہ کھیل میں مشغول ہوگئیں تو انہیں جیسے کھلا میدان مل گیا۔ جانے کیوں اسے لگتا تھا کہ وہ ہنزا اور حمود جیسے حاضر جواب اور پر اعتماد بچوں سے خائف رہتی ہیں اور ان کے سامنے بہت سنبھل کر بات کرتی ہیں۔

''تم تب سے بھیونڈی نہیں گئی۔''ان کے انداز سے وہ سمجھ نہیں پائی یہ سوال ہے یا بیان، پھر بھی جواب تو دینا تھا۔

''نہیں۔''

''ادھر سے تو کوئی آیا ہوگا؟''

''نہیں، لیکن فون پر سب سے بات ہو جاتی ہے۔'' اس نے صفوان اور ہادی کو ''سب'' بنا دیا۔ ان دونوں کو واقعی اس کی فکر تھی یا کوئی احساس جرم اور پچھتاوا کہ وہ وقتاً فوقتاً اس کا حال احوال جاننے فون کرتے رہتے تھے۔ وہ اسے اس کے مائیکہ کی غیر موجودگی کا احساس کروا رہی تھیں۔

ان کی تیکھی اور ناقدانہ نظر محسوس کر کے وہ نروس ہونے لگی تھی۔

''یہ بچے کب تک صوفی صوفی کرتے رہیں گے؟'' وہ اسی قسم کے سوال سے ڈر رہی تھی۔ ''دوسری اور سوتیلی سہی لیکن اب تم ہی ان کی ماں ہو، امی می نہیں لیکن کم از کم آپا باجی تو پکارے۔''

''نہیں مجھے صوفی بلانا اچھا لگتا ہے اس لیے میں نے بھی آپا باجی لگانے کے لیے نہیں کہا، اب تو مجھے بھی صوفی سننے کی عادت ہو گئی ہے۔''

''عادت ہو گئی ہے تو بدل جائے گی، بچوں کا یوں تمہیں سب کے سامنے صوفی صوفی کہنا کسی لحاظ سے مناسب نہیں ہے۔'' وہ بحث نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے چپ ہو رہی۔

فاطمہ آپا روایتی بہن تھیں جنہیں لاکھوں میں ایک، چالیس سال کے قریب پہنچ رہے، دو بچوں کے باپ، اپنے بھائی کیلیے بیس بائیس سال سے زیادہ عمر کی یتیم لڑکی، دوسری بیوی کی صورت میں قبول نہیں تھی۔ وہ ہارون کی عبدالحمید سر کے لئے عقیدت سے واقف تھیں۔ ہارون جیسے ہی خیالات ان دونوں کی والدہ کے بھی تھے۔ اگر وہ آج زندہ ہوتیں تو بہت خوشی سے اسے اپنی بہو مان لیتیں۔ لیکن فاطمہ آپا کی نظر میں عبدالحمید سر کے احسان اور قرض اتارنے کا یہی ایک راستہ نہیں تھا۔ ہارون عبدالحمید سر کو زبان دینے کی بجائے پہلے ان سے بات کرتا تو وہ کسی طرح دوسرا راستہ نکال کر ہارون کو قائل کر سکتی تھیں لیکن ہارون کے حامی بھر لینے کے بعد ان کے اختیار میں کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے اعتراضات کا برملا اظہار نہیں کر سکتی تھیں لیکن آج ان کے ہاتھ کچھ لگا تھا جس نے انہیں اکسایا تھا۔

''تمہارا کتنا سامان ابھی تک سر کے کمرے میں ہی ہے۔''

پھر وہی انداز جسے سمجھنا مشکل تھا کہ یہ سوال ہے یا بیان۔

''سر وہاں تھے تب کی بات الگ تھی، لیکن اب تو وہ کمرہ خالی ہونا چاہیے۔''

''السلام علیکم۔'' ہارون کی آمد پر اس نے شکر کا سانس بھرا۔
اسے جواب تو نہیں سوجھ رہا تھا لیکن ذہن میں فاطمہ آپا کی طرف سے آنے والے اگلے متوقع سوال ضرور گونج رہے تھے۔وہ اس کے لئے پانی لینے جانے لگی تو ہارون نے پکارا۔
''صوفی!'' وہ پلٹی۔
''کل کچھ فرنیچر آئے گا، وہ خالی والے بیڈروم میں رکھوا لینا۔''
''خالی بیڈروم کونسا ہے؟'' فاطمہ آپا نے پوچھا۔
''ایک ہی تو بیڈروم خالی ہے۔''
''ہا......آ......ں، وہاں فرنیچر کیوں؟''
''میں اپنا کام کرتا ہوں اور اسی وقت ہنزہ کو بھی اسکول کا کام ہوتا ہے، مجھے ڈسٹربنگ نہ ہو اس لیے وہ اسی خالی بیڈروم میں جا کر اپنا کام کرتی ہے، آپ کو تو علم ہے اس کے کرافٹ کے شوق کا۔سوچ رہا ہوں اسے ہنزہ کا بیڈ روم بنا دوں، ویسے بھی وہ بڑی ہو رہی ہے اور اس کی ڈیمانڈ ہے کہ حمود کی طرح اسے بھی ایک الگ بیڈروم دیا جائے۔''
اس سچ اور جھوٹ کی آمیزش پر وہ حیران تو تھی ہی لیکن سوچ رہی تھی کہ ''ظاہر ہے ہارون ان دونوں کی باتیں سن چکا ہے لیکن کہاں سے؟''
''جی ٹھیک ہے۔'' وہ سعادت مندی سے کہہ کر کچن میں آ گئی۔
فاطمہ آپا جب رات کھانے تک رکیں تو وہ نئی فکر میں مبتلا ہو گئی، اگر آج رات انہوں نے یہیں مقام کر دیا تو؟ وہ کھانے کے وقت تک کچن میں مصروف رہی کیونکہ فاطمہ آپا کی وجہ سے اسے اہتمام کرنا پڑا تھا۔ہنزہ ہارون کو بلانے گئی تھی جبکہ وہ سب ٹیبل پر ان دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔ چھ کرسیوں والے ڈائننگ ٹیبل پر حمود اور ہارون ایک ساتھ رکھی دونوں کرسیوں پر بیٹھتے تھے۔ہارون کے قریب والی سنگل کرسی پر ہنزہ اور اس کے بعد والی دونوں کرسیوں میں سے ایک پر صوفی کی جگہ تھی۔
آج آمنے سامنے کی دونوں سنگل کرسیاں فاطمہ آپا اور زوبیہ نے سنبھال لی تھیں۔حمود اور وہ اپنی روزانہ والی

جگہ بیٹھے تھے۔ ہارون نے اندر آنے کے بعد حمود کے ساتھ والی کرسی کھسکا کر ہنزہ کو وہاں بٹھایا اور خود صوفی کے بغل والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے یہ سوچ کر کیا تھا یا پھر یوں ہی لیکن اب تک فاطمہ آپا کے سامنے پردہ رہ جانے کی کوشش کرنے والی صوفی کو اس کی اس حرکت پر ایک دم غصہ آ گیا۔ زوبیہ فریج سے پانی کی ٹھنڈی بوتل لینے اٹھی تو اس نے ہنزہ کو کچھ کہتے ہوئے بہانے سے زوبیہ والی کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کی اور اس کا ارادہ بھانپ کر اس کے اٹھنے سے پہلے ہی ہارون نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باز رکھا۔ پل بھر میں امڈا غصہ، پل بھر میں دم توڑ گیا۔

ہارون کے ہاتھ پر دھری اس کی ہتھیلی سے نکلتا پسینہ ہارون کی انگلیاں بھگونے لگا تھا۔ زوبیہ کے واپس بیٹھتے ہی ہارون نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا لیکن باقی سارا وقت ٹیبل پر سب کو کھانا کھلاتے ہوئے اسے بڑی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔

شکر تھا کہ فاطمہ آپا رکی نہیں۔ بار بار یاد آتے اس پل اور لمس سے جھنجھلا کر اس نے ہارون کے لئے اپنے سابقہ خیالات اور غصے کو غیرت دلا کر جوش میں لانا چاہا مگر بے سود، وہ سب جیسے بہرے ہو گئے تھے۔ اس نے بار بار دل میں دہرایا کہ کیسے اس نے لفظوں کے پتھر مارے تھے اسے نفن کے وقت اور یہ کہ وہ کل تک بات بھی نہیں کر رہا تھا لیکن غصہ افیم کھا کر سویا تھا اور سر جھٹک جھٹک کر اب اسے چکر آنے لگے تھے۔

اسے لگا تھا کہ ہارون نے فاطمہ آپا کا شک دور کرنے کے لیے کہا ہے لیکن اگلے دن واقعی نیا فرنیچر آ گیا۔ میز اور کرسی کے علاوہ ایک بڑی الماری اور دوسری چھوٹی درازوں والی الماری تھی۔ ہنزہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا کہ یہ سب کچھ اس کے نئے کمرے کے لیے تھا۔ پہلے اس کمرے میں پلنگ اور اس کے ساتھ والی سائیڈ ٹیبل کے علاوہ صوفہ تھا۔ صوفی کا سامان ابھی تک بیگز میں ہی تھا۔ الماریوں کی وہاں سخت ضرورت تھی۔

کمرہ سیٹ ہوتے ہی دھیرے دھیرے ہنزہ کا بقیہ سامان بھی ہارون کے کمرے سے ادھر منتقل ہو گیا تھا۔ حمود خود اپنی پڑھائی کرتا تھا۔ کبھی مدد کی ضرورت پڑتی تو ہارون سے لے لیتا۔ ہنزہ کی پڑھائی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ ہارون اور حمود اس کی مدد کر دیا کرتے تھے لیکن اب دوسری ذمہ داریوں کے ساتھ ہنزہ کی پڑھائی بھی اس نے اپنے سر لے لی تھی۔

وہ بڑی دیر سے یوٹیوب پر ویڈیوز دیکھ کر باپ کے لیے بک مارکس بنا رہی تھی۔ صوفی بھی اس کے ساتھ لگی تھی۔ صفحات کے درمیان میں رکھنے اور کونوں پر لگنے والے بک مارکس درجن کے حساب سے بن رہے تھے۔ کیونکہ بقول ہنزر ”کتابیں بھی تو ہزاروں ہیں۔“

”آپ کے پاپا کے روم اور شیلف میں بکس رکھنے کی جگہ نہیں ہے، اور یہ اتنے سارے بک مارکس رکھنے کے لیے بھی بہت ساری جگہ چاہیے۔“ اس نے سامنے پھیلے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔ ”اب بس کرتے ہیں۔“

”نہیں صوفی، بک مارکس کیلئے جگہ نہیں چاہیے، یہ سب بکس میں رہیں گے۔“ ہنزر نے کاغذ موڑتے ہوئے مصروف انداز میں کہا تو دفعتاً اسے اپنی آئی کیو والی بات یاد آ گئی۔

”ہاہ، میں کیوں بھول جاتی ہوں سارا خاندان ہی ہائی آئی کیو والا ہے۔ کیا رہام بھی ایسی ہی ذہین تھی؟“ اسے اچانک خیال آیا۔ ساتھ یہ بھی یاد آیا کہ اس نے ابھی تک رہام کی ایک تصویر تک نہیں دیکھی ہے۔ گھر میں کسی کی کوئی تصویر نہ دیواروں پر ٹنگی تھی نہ میزوں پر رکھی تھی۔

”ہنزر۔“

”ہمم۔“

وہ شش و پنج میں تھی۔ اس سے سیدھے رہام کا پوچھنا مناسب نہیں تھا۔ اس کی خاموشی پر ہنزر سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

”آپ کے بچپن کی فوٹوز نہیں ہیں؟“

”ہیں نا۔“ وہ ہاتھ میں پکڑا کاغذ رکھ کر اٹھی اور میز کی دراز سے چھوٹا سا البم نکال کر اسے دیا۔

”باقی فوٹوز پاپا کے لیپ ٹاپ میں ہیں۔“ وہ پھر اپنی سابقہ جگہ بیٹھ کر مشغول ہو گئی۔

صوفی نے البم کھولا۔ پہلی تصویر ہی رہام اور ہارون کی شادی کی تھی۔ وہ بلاشبہ بہت خوبصورت تھیں۔ ہنزر اپنی ماں کی کاپی تھی۔ ہارون آج کی بہ نسبت قدرے دبلا تھا۔ اس کے چہرے پر زندہ دلی اور ایسی خوشی وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ شادی کی چند تصویروں کے علاوہ حمود اور ہنزر کی پیدائش اور حمود کی سالگرہ کی کچھ تصویریں تھیں، جن میں رہام کے والدین اور بہنیں بھی تھیں۔ ان میں ہارون کی امی بھی تھیں۔ اس نے رہام کو دیکھنے کیلئے ہنزر سے تصویر

کا پوچھا تھا لیکن اب وہ ماضی اور آج کے ہارون میں نظر آرہے واضح تضاد میں الجھ گئی تھی۔ آج والا سنجیدہ و متین ہارون تصویروں میں نہیں تھا اور تصویروں والی زندہ دلی اور شوخی کا آج والے ہارون میں ملنا مشکل تھا۔ کچھ دیر البم الٹ پلٹ کرنے کے بعد اس نے البم واپس دراز میں رکھ دیا۔

ہارون، رِہام اور پھر اس کی امی سے ہوتے ہوئے اس کی سوچ بھیونڈی اور پھر ماموں جان تک پہنچ گئی۔ وہ ماموں جان کے ساتھ وہاں سے نکلی تو اب تک پھر وہاں نہیں گئی تھی۔ اسے ڈھنگ سے یاد بھی نہیں تھا کہ اس نے کس طرح سارا گھر سمیٹ کر رکھا تھا۔ اس گھر سے جڑی یادوں کے علاوہ وہاں اور بھی بہت سی سنبھالنے والی قیمتی چیزیں تھیں۔ جن میں سرفہرست ماموں جان کی کتابیں تھیں۔ ایک کے بعد ایک اسے کتنی ہی چیزیں اور باتیں یاد آتی گئیں۔ اسے اپنی غفلت کا شدت سے احساس ہوا۔ کیوں اس نے اب تک پلٹ کر اس گھر کی خبر نہیں لی؟ اس کے اندر بے چینی پھیل گئی۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' دروازہ بجا کر ہارون اندر آیا۔

''آپ کے لیے بک مارکس بنائے ہیں۔'' ہُنر کے کہنے پر وہ پنجوں کے بل فرش پر بیٹھ کر دیکھنے لگا۔

''یہ سارے آپ نے بنائے ہیں؟'' اس نے سامنے پڑا ڈھیر الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہمم۔'' ہُنر نے زور زور سے سر ہلایا۔

''ویری گڈ اینڈ تھینک یو۔''

''یو ویلکم پاپا۔''

''یہ تو بہت اچھا بنایا ہے آپ نے۔'' نیلے پیلے اور گلابی رنگوں کے درمیان وہ سرخ اینگری برڈ نمایاں تھا۔

''یہ صوفی نے بنایا ہے۔''

''اچھا۔'' اس نے ہاتھ میں لے کر دیکھتے ہوئے معنی خیز ''اچھا'' کہا تھا۔

''مجھے بھیونڈی جانا ہے۔'' اس نے بک مارک اور اس کا معنی خیز ''اچھا'' نظر انداز کر کے اپنا مدعا بیان کیا۔

''کب؟''

''کل۔''

''ڈرائیور کے ساتھ چلی جانا یا تمہیں کوئی اور بھی ساتھ چاہیے؟''

''نہیں، ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ نگی۔''

''اوکے۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ ''میں ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں وہ وہیں رکے گا، اسی کے ساتھ واپس آجانا...... یا تم وہاں رکنے کا سوچ رہی ہو؟'' ہارون کی نظر اس کے چہرے پر تھی۔

''میں کل ہی واپس آجاؤں گی۔'' اس کی سنجیدہ شکل دیکھتے ہوئے اسے تصویر والا شوخ ہارون یاد آیا۔

''پاپا، میں بھی جاؤں صوفی کے ساتھ؟'' ہنزہ نے انگریزی میں کہا۔

''آپ کا اسکول ہے۔''

''میں چھٹی کرلوں گی۔''

''ہنزہ کو آنے دیں میرے ساتھ۔''

''ٹھیک ہے۔''

''تھینک یو پاپا'' ہنزہ کھل اٹھی تھی۔ وہ بھی مسکرا کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ صوفی نے دیکھا اس کے ہاتھ میں سرخ اینگری برڈ تھا۔

اگلے دن وہ صبح ہی ہنزہ کے ساتھ بھیونڈی کے لیے روانہ ہو گئی تھی۔ کار سے اترتے ہوئے دروازے کو دیکھ کر ہی اسے رونا آگیا۔ اسے لگتا تھا اس نے خود کو اتنا سنبھال لیا ہے کہ کہیں بھی یوں بے اختیار کمزور نہیں پڑے گی۔ پہلے مرحلے پر ہی یہ بھرم ٹوٹ گیا تھا۔ یہاں سے جاتے وقت کے سارے منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے تھے۔ ماموں جان کے بغیر اس گھر کا تصور ہی محال تھا۔ خالی، گرد آلود گھر میں قدم رکھتے ہی وہ ضبط کھو کر پھوٹ پھوٹ رو دی۔ ہنزہ پریشان اس کے پیروں سے لگ کے کھڑی اس کے چپ ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ جب بڑی دیر بعد بھی صوفی خاموش نہ ہوئی تو اس نے اس کا ہاتھ ہلایا۔

''صوفی!''

اس نے ہنزہ کو دیکھا، اسکی آنکھیں لبالب تھیں۔ اس نے جھٹ چہرہ صاف کیا۔

”سوری، ماموں جان یاد آ گئے تھے۔“ اس نے کہا تو ہنر نے یوں سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو ”میں سمجھتی ہوں۔“

اس نے پہلے گھر کی صفائی کی پھر ہر کمرے کی بڑی بڑی چیزیں جیسے پلنگ، میز، کرسیاں وغیرہ صحیح طریقے سے سمیٹ کر ایک جگہ کیں اور ان کو چادروں سے ڈھانکا۔ اس کے بعد اس نے ماموں جان کے کپڑے اور کتابیں نکالیں۔ اس نے صفوان کو فون کر کے بلایا تھا۔ اس دوران ہنر سے نظر بچا کر رونا بڑا دشوار تھا۔ پہلے اسے لگا کہ اس نے ہنر کو لا کر غلطی کی ہے لیکن پھر احساس ہوا کہ اگر وہ ساتھ نہ ہوتی تو وہ بس روتی رہتی، کام ایک بھی نہ ہوتا۔ ہنر بھی اس کے ساتھ چھوٹے موٹے کام کر رہی تھی۔ صفوان کھانا لے کر آیا تھا۔ ان تینوں نے ساتھ میں کھانا کھایا۔ اس نے ماموں جان کی کچھ کتابیں اپنے لیے رکھ کر باقی ساری مقامی لائبریری میں بجھوا دیں۔ ان کے کپڑے بھی صفوان کو دے دیئے کہ وہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دے۔ اس نے گھر کی ایک چابی صفوان کو دی تا کہ وہ ہفتہ دس دن میں گھر کی صفائی کرواتا رہے۔ چند کتابیں، ماموں جان کی بہت پرانی ڈائریاں، جن میں پیسوں کے حساب کتاب کے علاوہ ان کی پسندیدہ غزلیں اور اقتباسات لکھے تھے، ان کی شال اور تکیہ، اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اس نے بیگ میں رکھ لئے تھے۔ وہ واپس گھر پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ ہارون ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھا تھا۔

”سب ٹھیک ہے وہاں؟“ ہارون نے اس سے پوچھا۔

”ہاں۔“ اسے سوال ہی نہیں سمجھ آیا تھا۔ وہ کس کے بارے میں پوچھ رہا تھا؟ کیا ٹھیک ہے وہاں؟ خالی گھر؟ گلی، محلہ یا اہل بھیونڈی؟ پھر بھی اس نے جواب دے دیا۔

ہنر باپ کی گود میں چڑھ گئی تھی۔

”پاپا! صوفی وہاں بہت رو رہی تھیں۔“ وہ بیگ رکھنے اپنے کمرے میں آئی تو ہنر نے باپ سے رازدارانہ انداز میں کہا۔ اس کی سوجی آنکھیں دیکھ کر ہی اس نے وہ سوال کیا تھا۔

”اچھا، انہیں دادا جان کی یاد آ رہی ہو گی بیٹا۔“

”ہاں، صوفی نے بھی یہی کہا تھا۔“

”ہم، آپ بھی چینج کر لو پھر کھانا کھاتے ہیں۔“

”جی پاپا۔“ وہ کود کر اتری اور کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔

”جتنا آسان ہمیں لگتا ہے، بھلانا اتنا آسان نہیں ہوتا ہے۔“ اس نے صوفے کی پشت پر سر ٹکاتے ہوئے سوچا۔ ہنزر کے ضد کرنے پر وہ کھانے کے لئے کچن میں چلی آئی تھی لیکن اس کا کھانا کھانے کا بالکل بھی من نہیں تھا۔ ہنزر کے کھانا ختم کرنے تک وہ بھی اپنی پلیٹ میں نکالے تھوڑے سے چاولوں میں چمچہ چلاتی رہی تھی۔

ہنزر کے سونے اور باقی سب کے اپنے اپنے کمروں میں جانے کا یقین ہوتے ہی وہ باہر نکل آئی اور ڈرائنگ روم کے باہر آ کر چھوٹے سے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ آج اسے ماموں جان بہت یاد آ رہے تھے۔ بڑے دنوں بعد اسے بیماری کے دنوں کے علاوہ ماموں جان کے ماضی کی دیگر باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں انکی حساب کتاب والی ڈائری تھی۔ جس میں انہوں نے تاریخ کے ساتھ، کس کو کتنے پیسے دیے ہیں، لکھ کر رکھا تھا۔ لیکن ان پیسوں کی واپسی کا اندراج کہیں نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ انہوں نے کسی سے واپسی کا تقاضہ نہیں کیا ہوگا، جس نے خود سے واپس کر دیا، کر دیا۔

قدموں کی آہٹ پر اس نے پلٹ کر دیکھا، پیچھے ہارون کھڑا تھا۔ وہ بنا کچھ کہے سیڑھی کے دوسرے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا تو صوفی نے ڈائری اسے دے دی۔ دو چار اوراق پلٹنے کے بعد اس نے ڈائری بند کر دی۔

”سر ٹیوشنز لیتے تھے۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولنے لگا۔ صوفی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ”لیکن جب کالج کے فرسٹ ایئر میں، میں نے ٹیوشن لینا اسٹارٹ کیا تو سر نے اپنے سارے اسٹوڈنٹس میرے پاس بھیج دیے تھے، یہ کہہ کر کہ مجھ سے اچھا استاد وہ ہے۔“ وہ ذرا سا ہنسا۔

”اس کے بعد انہوں نے پھر کبھی ٹیوشنز نہیں لیے۔ ان کے پاس آنے والے ہر بچے کو وہ میرے یہاں بھیج دیا کرتے تھے اور سچ کہوں تو انکے اس بھروسے کی وجہ سے میں نے ان ٹیوشنز پر بہت محنت کی تھی۔ میں اپنے سر کا نام خراب نہیں کر سکتا تھا۔ میرے پاس بھی ہے ایک ایسی ڈائری۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈائری کو دیکھا۔ ”جس میں میں نے......“ وہ ذرا رکا۔ ”اپنے لئے...... تاکہ میں کبھی نہ بھولوں...... سر کی ہر مہربانی اور مدد نوٹ کر کے رکھی ہے، میں اسے پڑھتا رہتا ہوں۔ سر اکثر کہتے تھے کہ کتنی ہی بلندی تک کا سفر طے کر لو، چاہے

آسمان چھو لو لیکن اگر وہاں پہنچ کر تمہیں اپنا آغاز اور ابتدا یاد نہ آئے تو سمجھو تم نے کچھ حاصل نہیں کیا، تمہاری کامیابی کے کوئی معنی نہیں ہے اگر تم اپنی بنیاد اور اپنا اصل بھول جاؤ، منزل پر پہنچ کر راستے کی مشکلیں اور رکاوٹیں یاد رکھ کر ہی کامیابی اور بلندی کے غرور اور تکبر سے بچا جا سکتا ہے۔'' اس نے بات کے اختتام پر گردن موڑ کر صوفی کو دیکھا۔ صوفی نے اس سے نظر ہٹا کر احاطے کی دیوار کے ساتھ لگے گملے پر مرکوز کر دی۔

''میں میتھس میں ہمیشہ سے کمزور رہی ہوں، پھر بھی اسکول میں کسی نہ کسی طرح پاس ہو جاتی تھی کہ اس سے چھٹکارہ نہیں تھا۔ ٹینتھ میں مجھے یہ فکر لاحق ہوئی کہ میتھس اور سائنس کے ٹیچر، ماموں جان کے لیے بڑی شرمندگی کا باعث ہوگا اگر ان کی بھانجی ٹینتھ کے بعد آگے سائنس نہ رکھے، اس لیے میں نے مان لیا تھا کہ ماموں جان کی خاطر مجھے جونیئر کالج اور اس کے بعد بھی میتھس پڑھنا پڑے گا، اس ٹینشن میں، میں ٹینتھ کے پریلیمز میں میتھس میں فیل ہوگئی، تب میں نے روتے ہوئے انہیں بتایا کہ مجھے میتھس کس قدر ناپسند ہے اور اسے آگے جھیلنے کا خوف مجھے بورڈ میں فیل کروا کر ہی دم لے گا۔ ماموں جان میری بات سن کر بہت ہنسے تھے۔'' وہ منظر یاد کر کے اس کے چہرے پر تبسم بکھر گیا۔

''تب ماموں جان نے کہا تھا کہ مجھے میتھس پسند نہیں ہے تو ٹینتھ کے بعد اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں اور یقین کریں، اس دن میتھس سے پیچھا چھوٹنے پر میں نے جو سکون محسوس کیا تھا، آج بھی مجھے یاد ہے۔'' اس نے آنکھیں بند کر کے وہ لمحہ یاد کیا اور پھر آنکھیں کھولتے ہوئے دل میں سوچا۔ ''ہاہ! میری لو آئی کیو۔''

اس نے ہارون کو دیکھا تو وہ بھی مسکرا رہا تھا۔

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ ہماری اس فائن ٹیوننگ کی پہلی وجہ سائنس اور میتھس میں ہماری یکساں دلچسپی ہی تھی۔''

''شاید، کیونکہ ہادی بھائی کو بھی میتھس اور سائنس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، ہم دونوں سے ملی مایوسی کی تلافی شاید آپ نے کر دی تھی۔''

''شاید، مجھے یاد ہے۔'' وہ اپنے اسکول کا واقعہ سنانے لگا۔

پھر آہستہ آہستہ اجالے کی جانب سفر کرتی رات کے ساتھ وہ دونوں بہت دیر تک ماموں جان کی یادوں سے ان کے درمیان ٹھہری تکلف اور سرد مہری کی تاریکی میں اجالا کرتے رہے۔ آخر صوفی کو ہی یاد آیا کہ اگلے دن چھٹی نہیں ہے۔

''بہت دیر ہوگئی ہے۔'' اس نے یاد دلایا اور کھڑی ہوگئی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا تو ہارون نے ڈائری اسے تھما دی۔ ہارون اب بھی بیٹھا تھا۔

''آپ کو کل سینٹر نہیں جانا؟'' اس سوال نما فکر پر اس نے ذرا حیرت سے صوفی کو دیکھا اور پھر کھڑا ہوگیا۔ وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے اندر آئے اور پھر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

✿......✿......✿

ہنزہ اسکول سے آئی تب سے ہی اسے چپ محسوس ہو رہی تھی۔ صوفی نے پوچھا کیا ہوا ہے تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس نے بھی سوچا کہ فرصت سے اس کے پاس بیٹھ کر بات کریں گی لیکن وہ فرصت ملی ہی نہیں۔ عربی پڑھانے والے مولوی صاحب آگئے پھر وہ اپنی ڈرائنگ کلاس کو چلی گئی لیکن پھر رات میں ڈائننگ ٹیبل پر ہنزہ کی چپ کی وجہ جان کر وہ پچھتائی کہ پہلے ہی کیوں نہ اس سے بات کر لی۔

''پاپا، صو......فی میری مما ہیں ناں؟'' کوئی بے آواز بم ہی گرا تھا۔ ہارون کا منہ کی طرف جاتا ہاتھ درمیان میں ہی جم گیا۔ اس کا بھی یہی حال تھا۔

''ہنزہ ......'' ہارون نے ہاتھ نیچے کرتے ہوئے حیرت سے بیٹی کو دیکھا۔

''آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' وہ باپ سے ناراض تھی۔ اس نے رخ صوفی کی طرف کیا۔

''اور آپ نے بھی نہیں بتایا۔'' وہ صوفی سے بھی ناراض تھی۔

''آپ سے کس نے کہا یہ؟'' حمود نے اس سے انگریزی میں پوچھا۔

''مجھے زوبیہ آپی نے کہا تھا۔'' اس نے اسی زبان میں جواب دیا۔ ''کہ صو......فی ...... پاپا کی وائف ہے تو وہ میری مما ہوئیں، آج یہی بات میں نے اپنی فرینڈز سے کہی تو سب نے میرا مذاق اڑایا۔'' اس کا منہ پھول گیا۔ ''کہ میں اپنی مما کو مما نہیں کہتی، ان کے نام سے بلاتی ہوں۔'' اس نے صوفی کو دیکھا۔

"آپ نے مجھے روکا کیوں نہیں؟ کوئی بھی اپنی مما کا نام نہیں لیتا ہے، یہ بیڈ مینرز ہوتا ہے۔"

"بیٹا! آپ نے خود ہی صوفی کو صوفی بلانا ڈیسائیڈ کیا تھا۔" ہارون نے یاد دلایا۔

"تب وہ آپ کی وائف نہیں تھیں۔"

ہاہ، بچے! اس وقت ہنزہ بڑی کلیئر تھی، اسے کوئی کنفیوژن نہیں تھا۔ ٹیبل پر موجود سارے نفوس ساکت تھے سوائے ہنزہ کے جو باری باری سب کو دیکھ رہی تھی۔

"میں اب آپ کو مما بلاؤں گی۔" اس نے صوفی کو دیکھتے ہوئے اعلان کیا اور اچانک، بہت اچانک صوفی کا دل ایسا گداز ہوا کہ آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس لفظ میں کوئی جادو تھا یا کوئی قوت کہ کہیں دبی ممتا مما سن کر یکا یک جاگ گئی تھی۔ وہ ہنزہ کی بات سے زیادہ اب اپنی حالت پر حیران تھی۔ خود کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ بڑی پریکٹیکل لڑکی ہے، جذباتی تو بالکل نہیں۔

"سوری، اتنے دن میں نے آپ کو مما نہیں کہا۔" صوفی نے اپنی آواز روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ لیا لیکن آنکھیں چھلک پڑیں۔

"آپ رو کیوں رہی ہیں؟ کہا تو اب مما کہوں گی۔" وہ روتے روتے ہنس پڑی۔ اس نے دوپٹے سے آنسو پونچھ کر سر ہلایا۔ وہ اب بھی بولنے کے قابل نہیں ہوئی تھی۔ اپنی حالت فی الحال خود اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

"بھائی! آپ بھی انہیں مما کہاں کریں۔" اب اس نے بھائی کو دیکھا۔

"نہیں، میں انہیں صوفی ہی بلاؤں گا۔"

"یہ بیڈ مینرز ہے بھائی۔" ہنزہ نے جیسے بھائی کی ناسمجھی کا ماتم کیا۔

"پاپا!" حمود نے مدد کے لیے باپ کو پکارا۔

"آپ جو بھی بلانا چاہیں، آپ کی مرضی ہے۔" ہارون نے انگریزی میں بیٹے کو تسلی دی۔

"لیکن پاپا!"

"ہنزہ۔" ہنزہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن صوفی نے درمیان میں اسے ٹوک دیا۔

"حمود کا صوفی کہنا مجھے اچھا لگتا ہے، بیڈ مینرز نہیں لگتا۔ آپ کو یاد ہے نا حمود نے کہا تھا کہ فرینڈز کو نام سے

پکارتے ہیں، اور مما سے زیادہ میں حمود کے لیے فرینڈ ہوں، ہے ناں حمود؟" اس نے باپ بیٹے کی مشکل آسان کر دی۔

"ہاں ہنزر، صوفی میرے لیے فرینڈ ہے۔" اس نے ہنزر سے انگریزی میں کہا۔

ہنزر نے باپ کو دیکھا، ہارون نے اشارے سے "صحیح ہے۔" کہا۔ وہ اس نکتہ سے متفق نہیں تھی، مما فرینڈ ہے تو بھی انہیں مما ہی کہنا چاہیے، نام لینا ضروری نہیں، لیکن باپ کی بات اس کے لیے آخری ہوا کرتی تھی۔

"اوکے۔" وہ ذرا ٹھہری۔ "مما۔"

صوفی مسکرا دی۔ ہارون نے بھیگی پلکوں کے ساتھ مسکراتی صوفی کو دیکھا اور پھر ادھر ہی دیکھتے رہنے کی خواہش دبا کر اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔ وہاں موجود کسی نے بھی حمود کا سپاٹ چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

ہنزر پہلا لفظ بولنا سیکھنے والے بچے کی طرح مما مما کی گردان لگائے رکھتی۔ اسے بھی اس کا مما کہنا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ پکانا ختم کر کے وہ کمرے میں آ کر تیار ہوئی۔ اسے ہنزر کو لینے اسکول جانا تھا۔ جانے سے پہلے بی بی کو کچھ ہدایت دینے کی خاطر وہ انہیں ڈھونڈتی کچن میں آئی۔ وہ فرصت کے اوقات میں اکثر کچن میں ہی ایک طرف سے چٹائی ڈال کر آرام کرتی تھیں۔ وہ کچن میں تو نہیں تھی لیکن کھڑکی کی دوسری طرف سے ان کی آواز آ رہی تھی۔ وہ باہر احاطے میں کھڑی کسی سے فون پر بات کر رہی تھیں۔ وہ دروازہ کھول کر باہر جانے کے لیے آگے آئی لیکن کھڑکی سے آتی آواز سن کر رک گئی۔

"حمود بابا نہیں کہتے ہیں...... ہاں...... نہیں، کبھی نہیں دیکھا...... باہر تو بالکل نہیں جاتے...... کوئی سامان نہیں ہے۔ صاحب کے کمرے میں...... جی...... کیسے، وہ میرے آنے سے پہلے وہ جاگ جاتی ہیں...... جی اچھا، بتاؤں گی...... ہاں، وہ بھی دھیان رکھوں گی۔" پہلے اس کی آنکھیں پھیلیں اور منہ کھلا رہ گیا لیکن کوئی مشکل پہیلی نہیں تھی یہ سمجھنا کہ دوسری طرف فاطمہ آپا ہیں۔ وہ غصہ پیتی، انہیں ہدایت دیئے بغیر ہی ہنزر کو لینے چلی گئی۔

رات میں ہنزر کے سو جانے کے بعد اس نے ہارون کے دروازے پر دستک دی۔

"آ جاؤ۔" وہ حسب امید ہاتھوں میں کتاب لیے بیٹھا تھا اور خلاف امید اس کی آنکھوں پر عینک لگی تھی۔

اندر کا منظر دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو بھول گئی کہ کیوں آئی ہے۔ جب سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ہارون نے ''ہمم۔'' کیا تو وہ خود کو سنبھال کر سنبھلی۔

''بی بی کا اہم کام کھانا بنانا تھا، جواب میں کر لیتی ہوں، اس لیے اب ان کی ضرورت نہیں ہے، آپ ان کی چھٹی کر دیں۔''

''لیکن وہ دوسرے کام تو کرتی ہیں۔'' اس نے عینک نکال کر ہاتھ میں پکڑی اور اس کا دل چیخا۔ ''کیوں۔''

''اس کے لئے صبح سے شام تک کسی کے گھر میں رہنے کی ضرورت نہیں، صفائی اور برتن وغیرہ کے لئے چند گھنٹوں کے لئے کسی اور ملازمہ کا انتظام کر دیں۔''

''کوئی اور کیوں جب بی بی ہے تو......؟'' اس نے الجھ کر کہا۔ ''کوئی پرابلم ہے؟ کچھ ہوا ہے؟ کیا وہ......''

''آپ نے کہا تھا، یہ میرا گھر ہے، جو چاہے کر سکتی ہوں۔'' اس نے اس کی زہر آلود بات کا نصف حصہ یاد دلایا۔ ''یا وہ صرف جملہ تھا؟'' وہ ذرا دیر خاموش اسے دیکھتا رہا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے عینک واپس لگالی۔ ''کسی دوسرے ملازم کا انتظام ہونے تک برداشت کر لو۔'' اس نے ہاتھوں میں پکڑی کتاب پڑھنے کے لئے سامنے کی تو وہ باہر نکل گئی۔

''یعنی وہ صرف جملہ نہیں تھا۔'' اس کا دل خوامخواہ اداس ہو گیا۔

تین دن بعد بی بی اس کے پاس فریاد لے کر آئیں کہ وہ ہارون سے ان کی سفارش کرے۔ اس نے بڑے آرام سے خالص بیویوں والا رونا رویا کہ ''وہ میری سنتے کہاں ہیں۔''

بی بی کی جگہ دوسری ملازمہ گھر کی صفائی اور برتن کے لیے پہلے صبح دس بجے آتی اور دوسری بار شام میں سات بجے۔ بی بی کے گھر سے جانے کے اگلے ہفتے، فاطمہ آپا اپنی نند کی بیٹی شغف کے ساتھ حاضر تھیں۔ شغف ایم ایس سی کے فائنل ائیر میں تھی۔ وہ اسے ہارون سے ملوانے لائی تھیں تا کہ ہارون پڑھائی میں اس کی مدد کر سکے۔ اس دن پہلی بار فاطمہ آپا اور صوفی نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیسے ایک دوسرے کو چیلنج کیا تھا۔

''یہ میرا گھر ہے۔''

''یہ میرا بھائی ہے۔''

یہ دو عورتوں کے بیچ مقابلے کا بگل تھا۔

⁂

ہنر کے اسکول سے فون آیا تھا، وہ سلائیڈ سے گر کر پیر زخمی کر بیٹھی تھی۔ اسکول میں ہی مرہم پٹی ہوگئی تھی پھر بھی وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اس کا رونا دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے درد کے لیے دوائی دی تھی۔ گھر پہنچ کر بھی ہنر کا رو رو کر برا حال تھا۔ درد اور تکلیف سے زیادہ اسے پیر پر بندھی پٹی دیکھ کر رونا آ رہا تھا۔ صوفی نے پہلی بار اس کے نخرے دیکھے۔ اسے ہنسی بھی آ رہی تھی اور پیار بھی۔ وہ ذرا بھی ہلنے جلنے پر تیار نہ تھی۔ دوا کی اتنی فکر کے دو گھنٹے میں چار بار پوچھ چکی تھی ''مما کیا دوا کا ٹائم ہوگیا؟'' اسے ڈرائنگ روم کے صوفے پر ہی سب چاہیے تھا۔

ہارون گھر آیا تو صوفے پر کشنز کے درمیان بیٹھی ہنر کارٹون دیکھ رہی تھی۔ پیر سامنے ٹیبل پر تھے، ہاتھوں میں اسٹرابیری ملک شیک کا گلاس تھا جسے وہ اسٹرا سے پی رہی تھی، دائیں بائیں اس کے سوفٹ ٹائیز رکھے تھے، ٹیبل پر چاکلیٹس اور چپس کے خالی ریپرز اور پیکٹ کا ڈھیر لگا تھا۔

''پاپا!'' اسے دیکھتے ہی وہ پھر رونے لگی۔ روتے ہوئے ساری داستان از سر نو پھر بیان ہوئی جو ذرا دیر پہلے لفظ بہ لفظ حمود کو سنائی جا چکی تھی۔

''اوہ میرا بیٹا۔'' ہارون نے اسے گود میں لیا۔ ''درد ہو رہا ہے؟''

ہنر نے بھری بھری آنکھوں کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ اس کی ایمانداری پر صوفی کو بے ساختہ ہنسی آ گئی جسے اس نے بڑی مشکل سے کنٹرول کیا۔

''مجھے فون کیوں نہیں کیا؟'' ہارون نے بیٹی کو پیار کرنے کے بعد صوفی سے پوچھا اور اسی لمحے اسے خیال آیا کہ ان دونوں کے پاس ایک دوسرے کے فون نمبرز نہیں ہیں۔

''آپ خوامخواہ پریشان ہوتے اس لیے۔'' صوفی بی بی کو تو اب بھی یاد نہ آیا۔ پھر ہنر نے باپ کے ہاتھوں ہی کھانا کھایا، کتاب سے کہانی سنی، کچھ دیر اسکریبل کھیلا۔

''مجھے سونا ہے۔'' سارے ناز اٹھوانے کے بعد جب اسے نیند آنے لگی تو اس نے اعلان کیا۔

''او کے چلو۔'' ہارون نے کھڑے ہو کر اسے اٹھانا چاہا۔

"میں مما کے پاس سوؤں گی۔" اب تک لاڈلی بیٹی کی اولین ترجیح رہے باپ کو دھچکا لگا تھا۔ یوں تو ہر رات وہ ان دونوں میں سے اسی کے ساتھ سوتی جسکے ساتھ سونے کا اس کا دل کرتا، لیکن آج اس کا مزاج دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا تھا کہ وہ ہارون کے ساتھ سوئے گی۔ چونکی تو صوفی بھی تھی۔

"مما!" اس نے بازو اٹھا کر پکارا تو صوفی نے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھا لیا۔

"گڈ نائٹ پاپا۔" صوفی کے ساتھ ڈرائنگ روم سے باہر نکلتے ہوئے اس نے ہاتھ ہلایا۔

"گڈ نائٹ بیٹا۔"

حمود پہلے ہی اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ وہ بہت دیر تک وہیں بیٹھا کوئی ڈاکیومنٹری دیکھتا رہا۔ نیند آنے پر اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اس کا دل نہیں مانا تو وہ ہنزر کو دیکھنے کے لئے صوفی کے کمرے کے آگے رک گیا۔ اس نے ہلکے سے دستک دی، اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا، دروازہ کھلا تھا، وہ اندر آیا۔ دونوں سو رہے تھے۔ اسے دور سے دیکھ کر ہی پلٹ جانا چاہیے تھا لیکن وہ پلنگ کے قریب آیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف چہرہ کیے سوئی تھیں۔ صوفی کے بازو پر ہنزر کا سر تھا، ہنزر کا ایک ہاتھ اور پیر صوفی کے اوپر تھا۔ صوفی کا دوسرا ہاتھ ہنزر کے شانے پر دھرا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ہنزر کا سر آہستہ سے تھپتھپایا اور پھر صوفی کے چہرے پر آرہے بالوں کو پیچھے کیا۔ یہ ایک بے اختیاری عمل تھا۔ وہ کچھ دیر اس منظر کو دیکھتا رہا۔ صوفی کے چہرے سے ہٹ کر اس کی نگاہ سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون پر پڑی۔ اس نے فون اٹھایا، وہ لاک نہیں تھا۔ اس نے اپنا نمبر اپنے نام کے ساتھ محفوظ کیا پھر اپنا فون سائلینٹ کرنے کے بعد اپنے نمبر پر کال کر کے صوفی کا نمبر محفوظ کیا۔

فون واپس جگہ پر رکھ کر ان دونوں کو نظر بھر دیکھنے کے بعد وہ باہر نکلا تھا۔

کچن میں پانی کی بوتل بھرنے آئے حمود نے اسے صوفی کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں جاتے دیکھا تھا۔

آج سنیچر تھا اور شغف تنہا آئی تھی۔ ہارون کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے شغف کی آمد کی پہلے سے خبر تھی۔ آج وہ اپنی پڑھائی کا کوئی مشکل مسئلہ لے کر حاضر ہوئی تھی۔ اس کا مضمون فزکس ہی تھا۔ وہ دونوں موٹی موٹی کتابیں کھولیں ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ صوفی ان دونوں کے لئے کافی لے کر ڈرائنگ روم میں آئی تو میک

اپ شیک اپ میں تیار شغف کو دیکھ کر نہیں بلکہ ہارون کی آنکھوں پر چشمہ دیکھ کر اس کا دماغ خراب ہوا تھا۔

"یعنی حد ہے۔"

شغف سے سلام کے علاوہ اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ شغف نے بھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ ہنر کے ساتھ پورچ میں بیٹھی اس کا ہوم ورک کروا رہی تھی۔ چھٹی کے دن اکثر گھر کے تمام افراد اپنے کام ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ہی کرتے تھے۔ آج بھی ہنر معمول کی طرح اپنا بیگ لیے ڈرائنگ روم میں آئی تو ہارون نے اسے سمجھایا کہ آج پاپا وہاں اپنے مہمان کے ساتھ ضروری ڈسکشن کرنے والے ہیں اس لیے وہ کمرے میں یا پھر باہر بیٹھ کر اپنا کام کر لے اور ہنر نے اپنے کمرے کی بجائے باہر بیٹھنا پسند کیا تھا۔ حمود گھر میں نہیں تھا کیونکہ اسے سائنس ایگزیبیشن کی تیاری کے سلسلے میں آج بھی اسکول جانا پڑا تھا۔

ہنر کی پڑھائی ختم ہوئی تو اسے بھوک لگ گئی۔ کھانے کا وقت بھی ہو رہا تھا۔

"پاپا تو بزی ہیں۔" صوفی نے اندر دیکھتے ہوئے کہا۔ "چلو، آپ کھانا کھالو۔"

"میں پاپا سے پوچھتی ہوں۔" ہنر کہتے ہوئے اندر بھاگی۔

"پاپا! کھانا کھانے چلیں۔"

ہارون نے چونک کر گھڑی میں وقت دیکھا۔

"آپ چلو، ہم بھی پانچ منٹ میں آتے ہیں۔"

"اوکے۔" ہنر دوڑتی ہوئی باہر آئی۔

"پاپا بھی آرہے ہیں۔"

"اچھا۔"

وہ ہنر کا بیگ اٹھا کر اس کے ساتھ ڈرائنگ روم سے گزر کر اندر جانے کی بجائے کچن کے احاطے میں کھلنے والے دروازے سے اندر آئی۔ ہنر اپنا بیگ کمرے میں رکھ کر واپس آئی تب وہ کھانا گرم کر رہی تھی۔

صوفی کے کچھ کہے بغیر ہی وہ پلیٹیں اور گلاس ٹیبل پر رکھنے لگی۔ ہنر کی ان معصوم حرکتوں پر اسے بڑا پیار آتا تھا۔ وہ فریج سے پانی کی بوتل لینے قریب آئی تو صوفی نے اسے پکڑ کر روکا اور جھک کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

”گڈ گرل۔“ جواب میں اس نے بھی ایڑیوں کے بل اچک کر اس کا ماتھا چوما۔

”آپ بھی گڈ گرل ہے۔“ ہنزہ نے انگریزی میں کہا تو وہ ہنس دی۔

ٹیبل سیٹ ہونے کے بعد وہ دونوں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

”آپ کو بھوک لگی تھی نا، آپ شروع کرو۔“ صوفی نے اس کی پلیٹ میں روٹی رکھی اور سالن کا پیالہ آگے کیا۔

”نہیں، پاپا کے لیے رکتے ہیں۔“

اسی وقت ہارون شغف کے ساتھ اندر آیا۔ کھانے کا وقت تھا اس لیے ہارون نے اخلاقاً کہا تھا اور شغف واقعی کھانے کو رک گئی۔ مہمان نوازی کا تقاضا نبھاتے ہوئے ہارون نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ صوفی کے بازو والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہارون ہنزہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایک طرف صوفی، ہنزہ آمنے سامنے تھے دوسری طرف ہارون اور شغف۔ بظاہر کوئی غیر معمولی اور قابل گرفت بات نہ تھی لیکن جس طرح سے شغف اسے مسلسل نظر انداز کر رہی تھی، صوفی کی چھٹی حس اٹینشن میں آ گئی۔ اسے لگا اپنے مشن میں فاطمہ آپا اکیلی نہیں ہے۔

اگلے دن صوفی نے ہارون کو فون پر اسے آنے کا وقت دیتے سن لیا تھا۔ وہ اور حمود بڑی دیر سے اس کے کمرے میں مغز پاشی میں مصروف تھے۔ اپنے دیئے وقت سے ذرا دیر پہلے وہ دو تین موٹی موٹی کتابیں اور اپنی عینک اٹھائے ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں ہی منڈلاتی صوفی نے موقع ملتے ہی اس کی عینک وہاں سے غائب کر دی۔

شام میں اس نے ہارون کے کمرے میں جا کر وہ اسے واپس کی۔

”یہ صوفے کے پیچھے گرا تھا۔“ اس نے سفید جھوٹ بولا۔

”اوہ! تھینک یو۔“ ہارون نے عینک اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔ گھر میں رکی اس کی دوسری ایمرجنسی عینک ٹوٹ گئی تھی اور دوسری بنانے سے پہلے وہ ایک بار اپنی آنکھیں چیک کرانا چاہتا تھا۔ جس کے لیے اسے وقت نہیں مل رہا تھا۔

ہارون کے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس کے اندر کوئی ایڈونچر مکمل کرنے جیسا جوش اور خوشی تھی۔

”ہاہاہا۔ ہائی آئی کیو والے لوگ۔“

پھر یہ معمول ہو گیا۔ سنیچر اور اتوار کو شغف حاضر رہتی اور ہارون کو اپنا چشمہ نہ ملتا۔ وہ واقعی اتنا اچھا استاد تھا یا پھر فاطمہ آپا اور شغف مستقل مزاج اور ارادے کی پکی تھیں۔ تیسرے اتوار وہ اپنے ہاتھ کی صفائی دکھاتی عینک اٹھا کر وہاں سے جانے کو تھی کہ پیچھے سے ہارون نے پکارا۔

"صوفی!" صوفی نے دانتوں تلے زبان دبائی۔

"پکڑی گئی۔" وہ پلٹی نہیں تھی۔

"مجھے بنا گلاسز کے قریب کا پڑھنے میں مشکل ہوتی ہے۔" وہ اٹھ کر اس کے سامنے آیا۔

"اگر تمہیں شغف کا آنا پسند نہیں تو اپنی ان صلاحیتوں کا استعمال کرنے کی بجائے ڈائریکٹلی کہہ سکتی ہو۔" ہارون نے اس کے ہاتھ میں پکڑے عینک کی طرف اشارہ کر کے چوٹ کی۔

وہ چپ رہی۔ اب بھی اسے دل میں گدگدی ہو رہی تھی کیونکہ ہارون غلط سمجھا تھا۔ وہ اسے اصل وجہ نہیں بتا سکتی تھی، سو بہتر تھا وہ غلط ہی سوچے۔

"مزید اپنے ہاتھ کی صفائی دکھانے کی تکلیف نہ اٹھاؤ، آج کے بعد شغف نہیں آئے گی۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔ صوفی نے سر جھکائے عینک اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

"تھینک یو۔" وہ مزہ لے کر مسکرا رہا تھا۔ صوفی تیزی سے باہر نکل گئی۔

"ہاہاہا۔" ڈرائنگ روم سے باہر آتے ہی اس نے بے آواز تالی بجائی۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ سلور رِم کی فریم والے عینک میں وہ اسے اتنا اچھا لگا تھا کہ وہ نہیں چاہتی تھی کوئی اور بھی اسے اس طرح دیکھے۔ اس کا یہ چھوٹا سا راز محفوظ تھا۔ پھر نہ جانے ہارون نے فاطمہ آپا سے بات کی تھی یا شغف سے، لیکن اس دن کے بعد سے شغف نہیں آئی۔

⁂ ...... ⁂ ...... ⁂

ہنر نے صبح ناشتے کے وقت ہی اس کے کان میں سرگوشی کر کے اطلاع دی تھی کہ آج اسے اور حمود کو اس کے ساتھ شاپنگ پر جانا ہے، "سیکریٹ شاپنگ" پر۔ یہ دونوں کی طرف سے اجتماعی اطلاع تھی سو ہارون نے اشارے سے حمود سے پوچھا۔

”کیوں؟“
”صوفی کا برتھ ڈے ہے۔“ حمود نے آہستہ سے کہا تا کہ کاؤنٹر کے پاس کھڑی صوفی سن نا سکے۔
”اچھا۔“ یہ اس کے لئے واقعی ”خبر“ تھی۔
”میں آج شام میں جلدی آؤں گا، حمود، ہنزر آپ دونوں ریڈی رہنا، ہمیں باہر جانا ہے۔“ ہارون نے بلند آواز میں کہا تا کہ صوفی بھی سن لے۔
”او کے پاپا۔“ ہنزر نے اناڑی پن سے آنکھ مارنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے انداز پر حمود اور ہارون، دونوں کو ہنسی آ گئی۔ صوفی ان کی آواز پر اس نایاب منظر کو دیکھنے پلٹی۔ وہ تینوں ہی خوشگوار موڈ میں تھے۔ اس کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ رینگ گئی۔
شام میں صوفی کو گھر چھوڑ کر وہ قریبی شاپنگ مال میں آئے تھے۔ حمود تو فوراً ہی بک شاپ میں گھس گیا لیکن ہنزر کچھ طے نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے کیا تحفہ لینا چاہیے۔ سارا مال گھومنے کے بعد اس نے باپ کی طرف دیکھا۔
”کیا میں ایک سے زیادہ گفٹس لے سکتی ہوں؟“
”بالکل۔“
بس پھر کیا تھا کثیرالانواع چیزوں سے اس کا گفٹ باکس بھرتا گیا۔
وہ ہنزر کے اشارے اور پراسرار سرگوشیاں نوٹ کر رہی تھی لیکن اس کا ذہن اپنی سالگرہ کی طرف نہیں گیا تھا۔
اگلے دن صبح ناشتے کی میز پر حمود اور ہنزر نے وش کرتے ہوئے اسے تحائف دیے تو وہ سچ میں حیران ہوئی تھی۔ اسے چند دنوں پہلے تک یاد تھا کہ اس کی سالگرہ آ رہی ہے مگر پھر وہ بھول گئی تھی۔ حمود نے کارڈ کے ساتھ اسے تحفہ میں خالد حسینی کی ”اے تھاؤسنڈ سپلینڈڈ سن“ دی۔ وہ ایک بار پھر اس بچے کی سوچ پر حیران رہ گئی۔ انگلش ادب میں ماسٹرز کرنے کے بعد بھی سچائی یہ تھی کہ اس نے نصاب کے علاوہ کبھی انگلش ادب نہیں پڑھا تھا۔ ہاں، ماموں جان کی کتابوں سے اس نے اردو ادب کی کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ جونیئر کالج تک اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد، بی اے میں انگلش مضمون کا انتخاب کرتے ہوئے اور بہت سے طالب علموں کی طرح اس کی وجہ بھی انگلش ادب سے لگاؤ یا دلچسپی نہیں بلکہ فرانٹے سے انگریزی بولنے کی خواہش تھی۔ بعد میں اپنی اس

مضحکہ خیز وجہ پر وہ خود بھی کئی بار ہنسی تھی۔

"تھینک یو۔" اس نے مسکرا کر حمود سے کہا۔

"میرا کھولیں ناں!" ہنزہ بے صبری ہو رہی تھی۔ صوفی نے کتاب میز پر رکھی اور بڑا سا ڈبہ سامنے کر کے ریپر اتارنے کے بعد اسے کھولا۔ اندر مختلف سائز کے چھوٹے بڑے مزید ڈبے رکھے تھے۔ وہ باری باری سب کھولنے لگی۔ مختلف ڈیزائن اور رنگ کے ربر بینڈز، دولپ اسٹک، کاجل، والٹ، سلور فیشن جیولری کے برینڈڈ ایئر رنگز، انگوٹھی اور ایک چین۔

"میں نے یہ نہیں لیا تھا۔" ہنزہ نے چین دیکھ کر کہا۔

"ہیں ناپاپا؟" اس نے ہارون سے پوچھا۔

وہ وہیں ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھا چپ چاپ سب دیکھ رہا تھا۔ چائے کا کپ منہ کے قریب لے جاتے ہوئے ہارون نے شانوں کی حرکت سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ لاعلمی کے اس اظہار نے صوفی کو علم کرایا کہ وہ چین کا تحفہ کس کی طرف سے ہے۔ ایک بار پھر اسے لگا کہ اس کے چہرے کے سمت دوڑ کر آیا سارا خون ابھی چھلک پڑے گا، لیکن اس کی وجہ پچھلی بار کی طرح غصہ تو نہیں تھا۔

"تھینک یو۔" اس نے ہنزہ کا گال چوما۔ "اسپیشلی اس کے لیے۔" اس نے رنگ برنگی ربر بینڈز کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے پاس موجود سارے سیاہ اور سفید ربر بینڈز ڈھیلے ہو کر استعمال کے قابل نہ بچے تھے۔ ہنزہ نے غور کیا تھا یا یونہی لے آئی تھی، جو بھی تھا، فی الحال اسے سب سے زیادہ ضرورت اسی کی تھی۔

"باقی سب اچھا نہیں لگا؟" ہنزہ نے صدمے اور حیرانی سے پوچھا۔

"ارے نہیں، مجھے سب اچھا لگا ہے...... سب۔"

اس نے ساری چیزیں واپس ڈبے میں رکھتے ہوئے اپنے طریقے سے ہنزہ کے ساتھ ساتھ اس کا بھی شکریہ ادا کیا۔

بچوں کے اسکول اور ہارون کے سینٹر روانہ ہونے سے پہلے یہ طے ہوا کہ آج شام ڈنر باہر کر کے صوفی کا برتھ ڈے سیلیبریٹ کیا جائے گا۔

سب سے زیادہ ہُنر پر جوش تھی جیسے اسی کی سالگرہ ہو۔ اسی نے اس کے لیے کپڑوں کا انتخاب کیا۔ ساتھ ہی یہ اعلان بھی کہ اس کے پاس پنک اور پرپل ڈریسیز نہیں ہیں، اسے جلد ہی شاپنگ کی ضرورت ہے۔ اس کی فرمائش پر تحفے کی ساری چیزیں اسے پہننا پڑیں، کاجل اور لپ اسٹک کے علاوہ میک اپ بھی کرنا پڑا۔ اسے احساس ہوا کہ اپنی عمر کے بچوں کے مقابلے میں ہُنر کی زندگی بہت محدود ہے۔ یہاں کوئی آس پڑوس بھی نہیں تھا جن کے بچوں کے ساتھ وہ کھیلتی۔ اسکول سے گھر اور اس کے بعد ہفتے میں تین دن اس کی ڈرائنگ کلاسز کے علاوہ وہ اور کہیں نہیں جاتی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ کسی کا ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے اسے ہمیشہ اپنی کلاس میٹس کی برتھ ڈے پارٹیز مس کرنا پڑتی ہیں۔ یوٹیوب ویڈیوز دیکھنے کا شوق بھی شاید وقت گزارنے کی مجبوری میں اسے لگا تھا۔ ایک دو دفعہ اس نے آسٹریلیا اور امریکہ میں اس کے اسکول اور دوستوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ تب اس نے بتایا تھا کہ دادی تھیں تب تک وہ انہیں اپنے ساتھ پارک، شاپنگ اور ان کے دوستوں کے گھر لے جاتی تھیں۔ مگر ان کے بعد سے وہ اسکول، گھر اور کلاسز تک ہی محدود تھے۔

وہ تینوں تیار ہو کر بیٹھے ہارون کا انتظار کر رہے تھے۔ ہارون آیا تو اس کے پیچھے پیچھے جھما جھم بارش بھی چلی آئی۔

''اب؟'' حمود نے پوچھا۔

''تو کیا ہوا، ہمیں کار سے جانا ہے۔'' ہُنر کسی طرح یہ پلان کینسل نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''ہائے ٹائیڈ کا پریڈیکشن ہے، بہتر ہے ہم گھر میں ہی سلیبریٹ کر لیں۔'' ہارون نے اپنا فون اسکرول کرتے ہوئے کہا۔ وہ نیوز پڑھ رہا تھا۔

''پاپا'' ہُنر ٹھنکی۔

''ٹھیک ہے ناں بیٹا، ہم گھر میں ہی سلیبریٹ کرتے ہیں۔'' صوفی نے کہا۔ ''آپ بتاؤ کیا کھانا ہے ابھی فٹافٹ بنا لیتے ہیں۔''

''کچھ بنانے کی ضرورت نہیں۔'' ہارون نے ہاتھ پکڑ کر ہُنر کو صوفے پر بٹھایا۔ ''یہاں سے چوز کریں، آپ کو کیا منگوانا ہے اور کیا کھانا ہے۔'' وہ فوڈ ڈیلیوری ایپ کھولے اسے بتانے لگا۔ ہُنر اسکرین پر نظر آرہے رنگ برنگی کیک دیکھ کر فوراً مان گئی۔

وہ دونوں فون پہ جھکے پھر کھسر پسر شروع کر چکے تھے۔صوفی شیشے سے باہر برستی بارش دیکھنے لگی۔ ویسے ہی اسے آج ماموں جان بہت یاد آرہے تھے۔لیکن اس وقت اچانک بارش نے اسے تڑپا دیا تھا۔ برسات کے موسم کی وجہ سے اکثر اس کی سالگرہ والے دن بارش ہوتی تھی اور اس دن اسے یہ بارش بڑی اچھی لگتی تھی۔آج پہلی بار اپنی سالگرہ کے دن بارش دیکھ کر وہ اداس ہو رہی تھی۔ماموں جان اس کی سالگرہ کے دن اسے صبح صبح ہی پیسے دیا کرتے تھے۔جب تک ممانی جان تھیں، وہ اس کے لیے ہمیشہ نیا ڈریس بنواتیں، جو وہ اس دن پہنتی تھی۔اس نے کبھی کیک کاٹ کر اپنی سالگرہ نہیں منائی تھی،لیکن اس دن ممانی جان کھانے میں میٹھے کا اہتمام خاص طور سے کرتی تھیں۔ان کے بعد وہ بھی اپنی سالگرہ کے دن میٹھا ضرور بناتی تھی۔آج برسوں بعد اس دن کچھ میٹھا نہیں بنا تھا۔

کھانا اور کیک آرڈر کرنے کے بعد ہنر نے اس کے ہاتھ سے فون لیا اور کیک کی تصویریں دیکھنے لگی۔

ہارون نے سر اٹھایا۔وہ کمرے کے دوسرے سرے پر کھڑکی کے قریب کھڑی شیشے کے پار دیکھ رہی تھی۔وہ اٹھ کر قریب آیا۔وہ خیالوں میں ایسی کھوئی تھی کہ اس کے بازو میں آکر کھڑے رہنے پر بھی نہ چونکی۔

''صوفی!'' ذرا دیر اس کا کچھ نیا نیا اور اداس چہرہ دیکھنے کے بعد اس نے پکارا۔

''ہاں'' وہ یادوں سے باہر آئی۔

''سر کی کمی تو کوئی پوری نہیں کر سکتا۔'' وہ ہلکے سے مسکرایا۔

اس کی اداسی اور اداسی کی وجہ وہ جان گیا تھا۔اس نے پلکیں جھپکا کر آنسوؤں کو گال پر لڑھکنے سے باز رکھا۔

وہ رو کر ماحول اداس نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''سب آجائیں۔'' حمود کی اس انگریزی پکار پر دونوں ایک ساتھ پلٹے۔

وہ مونو پولی گیم کا ڈبہ لیے کھڑا تھا۔

''ہنر آؤ'' اس نے کافی ٹیبل اور اس کے نیچے کا رگ ایک طرف سرکا کر جگہ بنائی۔

''کھانا آنے تک ہم سب کھیلتے ہیں۔'' حمود نے فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

ہنر بھی فون رکھ کر اس کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ان دونوں کو بھی وہاں آکر بیٹھنا پڑا۔

حمود نے بورڈ کھول کر پھیلایا۔

’’آں۔ میں نے یہ گیم اس سے پہلے کبھی نہیں کھیلا ہے۔‘‘ ان تینوں نے بڑے افسوس سے اسے دیکھا۔ پھر حمود نے اسے پورا گیم سمجھایا۔ آج وہ خوشی خوشی سب کے ساتھ شامل تھا۔ اس کی سوچ میں تبدیلی ہارون کو صوفی کے کمرے سے نکلتے دیکھنے کے بعد آئی تھی۔

’’میں بینکر بنتی ہوں۔‘‘ حمود کی بات ختم ہونے کے بعد اس نے کہا۔

’’نہیں بینکر تو ہمیشہ میں ہوتی ہوں۔‘‘ ثمر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

’’اچھا‘‘ اس نے مری آواز میں کہا اور ان کا گیم شروع ہوا۔

اس دوران ان کا آرڈر بھی ڈلیور ہو گیا تھا۔ تھوڑا سا بریک لے کر انہوں نے کیک کاٹا۔ پھر دوبارہ کھیل شروع ہوا۔ بڑی دیر بعد جب بھوک لگی تو وہیں کافی ٹیبل پر ڈنر سرو ہوا۔ کیونکہ سب کچھ ثمر نے منتخب کیا تھا اس لیے ڈنر مختلف قسم کے پیزا اور کوک تھا۔ کھانے کے دوران بھی کھیل رکا نہیں تھا۔

اس نے نیا پیزا باکس کھول کر ایک ٹکڑا اٹھایا تو وہ زیادہ گرم نہیں تھا حالانکہ کھانا شروع کرنے سے پہلے وہ سب کچھ اوون سے گرم کر کے لائی تھی۔

’’میں گرم کر کے لاتی ہوں۔‘‘ اس نے پیزا کا ٹکڑا واپس رکھا۔ وہ ٹشو سے ہاتھ صاف کر رہی تھی، ہارون نے اس کا رکھا ٹکڑا اٹھا کر کھایا۔

’’ٹھیک ہے، گرم کرنے کی ضرورت نہیں۔‘‘

’’ابھی دو منٹ میں ہو جائے گا۔‘‘ وہ ڈبہ اٹھا کر کھڑی ہوئی۔

’’گیم پھر رک جائے گا۔‘‘ ثمر نے منہ بنایا۔

’’رہنے دو۔‘‘ ہارون نے ڈبہ اس کے ہاتھ سے لے کر نیچے رکھا، پھر اسے نیچے بٹھانے کے لیے اس کا ہاتھ پکڑا ہی تھا کہ زوبیہ نے اندر آ کر سلام کیا۔ اس کے پیچھے ہی فاطمہ آپا تھیں۔

’’آپ اتنی بارش میں کیسے؟‘‘ سلام کا جواب دے کر ہارون نے پوچھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ہی کھڑا ہوا پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر فاطمہ آپا کی طرف بڑھا جو ڈرائنگ روم کا منظر دیکھ کر سکتے میں تھیں اور اپنی لمبی غیر حاضری پر جی بھر کے پچھتا رہی تھیں۔ انہیں افسوس ہوا کہ کیوں انہوں نے ہارون کا فرصت اور وقت کی کمی کا بہانہ مان کر شغف

کو آنے سے منع کر دیا۔

''میں گھر سے نکلی تب بارش نہیں تھی، راستے میں ٹریفک کی وجہ سے اتنی دیر ہو گئی۔'' وہ اندر آئیں۔

''یہاں تو پارٹی چل رہی ہے۔'' زوبیہ نے ہمزہ کے پاس آ کر کہا۔

''ہاں، آج مما کا برتھ ڈے ہے۔''

''ہیپی برتھ ڈے ممانی۔'' اس نے اسے مبارک باد دی۔

''تھینک یو۔''

''آپ آئیں نا اندر۔'' ہارون نے وہیں دروازے میں کھڑی فاطمہ آپا سے کہا پھر پلٹ کر حمود کو مخاطب کیا۔

''آج گیم یہیں ختم کرتے ہیں۔'' اس نے انگریزی میں کہا تھا۔

''ونر تو بتادیں۔'' ہمزہ نے بھی اسی زبان میں کہا۔

''گیم اینڈ نہیں ہوا ہے تو ونر کیسے پتہ چلے گا؟''

''جس کے پاس سب سے زیادہ کرنسی ہے وہ ونر۔'' ہمزہ نے اعلان کیا۔

باپ کے اشارے پر حمود کرنسی گننے لگا۔ فاطمہ آپا اندر آ کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ کیک کے باقیات، کوک کے ٹن، پیزا باکسز اور نیچے پھیلے گیم سے ہوتی ہوئی ان کی نظر صوفی پر ٹھہر گئی۔ مرون اور گولڈن ڈریس میں سجی سنوری صوفی کو دیکھ کر پہلی نظر میں وہ بھی ٹھٹک گئی تھیں اور ہارون تو پھر......

''صوفی جیت گئی ہیں۔'' حمود کے اعلان پر وہ اپنے خیال سے باہر آئیں۔

''میں، ناممکن، ایک بار پھر چیک کرو۔''

''آپ ہی ونر ہے، کانگریٹس۔''

''ہے......'' ہمزہ نے تالیاں بجانے لگی۔

''میں پہلی بار کھیل رہی تھی، وہ بھی......'' اس نے رک کر باری باری باپ بیٹے کو دیکھا۔ ''یہ آپ دونوں نے تو مجھے نہیں جتایا؟''

''تھوڑا تو کانفیڈنس رکھیں، ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے، کیوں پاپا؟''

”ہاں۔“ ان کے انداز مزید مشکوک کرنے والے تھے۔

پھر زوبیہ اور فاطمہ آپا نے بھی کیک، پیزا اور کوک کے مزے لیے۔

”ادھر آئیں مما۔“ ہنر نے اسے پاس بلایا۔

”آنٹی! یہ رنگ، ائیر رنگ، چین، ربر بینڈ۔“ وہ اس کی پہنی ہر چیز کو چھو کر انہیں بتا رہی تھی۔ صوفی بڑے دلکش انداز میں مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ جنگ میں اپنا داؤ بھاری پڑنے والی مسکراہٹ تھی۔

”ہمم۔“ انہوں نے ہنکارہ بھر کر سامنے بیٹھے بھائی کو دیکھا، جس نے ابھی ابھی ادھر سے نظر ہٹائی تھی۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئیں۔

✿......✿......✿

دو دن بعد فاطمہ آپا پھر حاضر تھیں۔ وہ ہارون کے گھر آنے سے ذرا دیر پہلے ہی آئی تھیں۔ آنے سے پہلے انہوں نے ہارون کو فون کر دیا تھا کہ انہیں ضروری بات کرنی ہے۔ ہنر کے اسکول میں کل فٹبال ٹیم کا سلیکشن تھا سو وہ آج پریکٹس کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ آج پہلی بار ہی اس نے فٹ بال کو ہاتھ مطلب پیر لگایا ہے۔ پانچ چھ بار بال کو کک مارنے کے بعد اب اسے واش روم جانا تھا۔

”میں ابھی آئی۔“ وہ اندر بھاگی۔

صوفی بال لینے کے لئے آگے بڑھی جو ہارون کے کمرے کی کھڑکی پاس پڑا تھا۔ کھڑکی سے آتی آوازوں پر وہ فطری تجسس کے ہاتھوں رک گئی۔

”میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں ہارون۔“ فاطمہ آپا کا لہجہ بتا رہا تھا کہ لمبی بحث چلی آ رہی ہے۔ ”میں اب تک خاموش تھی اس کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ مجھے کچھ خبر نہیں ہے۔ تمہیں اس وقت جو درست لگا تم نے کیا، لیکن مصلحت کے تحت ہوئی اس شادی کو عمر بھر کے لئے گلے کا ہار بنانا ضروری نہیں ہے۔“

”آپا!“

”نہیں، آج سب سن لو۔ وہ لڑکی مجھے تمہارے اور بچوں کے لئے مناسب نہیں لگتی ہے، جس نے کوئی سگا رشتہ دیکھا، نہ بہن بھائی نہ ایک نارمل فیملی، وہ تمہیں اور بچوں کو کیا دے گی، اسے معلوم ہی نہیں ہے خاندان کیا ہوتا

ہے، ماموں کے یہاں بھی کون سا بھرا پورا گھر تھا، جسے رشتے نہیں ملے وہ کیا سمجھے گی رشتوں کی اہمیت، جیسے اس کے سوتیلے بھائیوں اور ماں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ بھی یہی کرے گی نا، یہی سیکھا ہے اس نے، آج نہیں تو کل، پہلے ہی تم اور بچے اتنا بڑا صدمہ جھیل چکے ہو، ایک نارمل فیملی تمہارا حق اور ضرورت ہے جو صوفی جیسی لڑکی نہیں دے سکتی،......اور میں کہاں کہہ رہی ہوں کہ تم سے بے یارو مددگار چھوڑ دو، وہ تھا نا تنویر، تم بات تو کرو، بلکہ ہم دونوں کرتے ہیں، انہیں سمجھائیں گے تو ہو سکتا ہے وہ مان جائیں۔" وہ بڑی دور کی کوڑی لائی تھیں۔

"آپا! پلیز اس طرح......"

"میں دشمن نہیں ہوں تمہاری۔ اس دنیا میں تمہیں بچے ہو میرا اما ئیکہ، اماں کے بعد اب یہ میری ذمہ داری ہے کہ تمہیں خوش رکھوں اور ظاہر ہے خوش رہنے والے میاں بیوی الگ الگ کمروں میں نہیں رہتے ہیں۔"

"مما!" پیچھے سے ہمزہ نے اسے آواز دی۔ پہلی بار اسے یہ آواز اور لفظ اجنبی لگا تھا۔ وہ اپنے پتھر ہوئے بھاری وجود کو لے کر پلٹی۔ اسی وقت ہارون نے کھڑکی کی طرف دیکھا، باہر لہراتا اس کا سبز آنچل اس کی نظر میں آ گیا تھا۔

"آپ رو رہی ہیں؟"

"نہیں تو۔"

"آپ رو رہی ہیں۔"

"ہم۔ ماموں جان یاد آ رہے ہیں۔" ہم کتنی بار اپنی پردہ داری کے لیے دنیا سے پردہ کر لینے والوں کا سہارا لیتے ہیں۔ اس جھوٹے اعتراف کے بعد اسے اجازت تھی، وہ بیٹھ کر باقاعدہ رونے لگی۔

"مما!" ہمزہ نے اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے اس کے آنسو صاف کیے۔

"مت روئیں۔" صوفی کے مزید قریب آ کر اس نے اس کے گلے میں بازو ڈال دیئے۔

"مما!" اس چھوٹے سے وجود کی حدت تھی کہ ذرا دیر پہلے والی باتوں سے رگوں میں جمتے خون میں پھر حرارت دوڑنے لگی۔

اس کے پاس ایک رشتہ تو ہے، ہر مجبوری اور بناوٹ سے پاک، دکھاوے سے مستثنیٰ، جس میں کوئی جھوٹ

اور نمائش نہیں ہے۔ ایک ایسا رشتہ جو سگا سوتیلا نہیں ہوتا، خالص محبت کا رشتہ۔ اس نے ہنزر کے گرد اپنی بانہیں پھیلا کر اسے خود سے لپٹا لیا۔

''میں مما ہوں آپ کی بیٹا اور آپ میری ہنزر۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''ہاں مما، آپ رونا بند کریں۔''

وہ اور تیزی سے رونے لگی۔

''پلیز مما!'' ہنزر نے روہانسی آواز میں کہا تو وہ سنبھلی۔ اسے خود سے الگ کر کے اپنا چہرہ صاف کیا۔

''آؤ، پریکٹس کرتے ہیں۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

باشعور اور باعقل کے چند جملوں نے اسے لمحوں میں بے وقعت کر دیا تھا۔ سگے رشتوں کے زمین و آسمان کے بغیر وہ خود کو خلا میں معلق محسوس کر رہی تھی۔ لیکن پھر ایک شعور سے پرے اور نا سمجھ نے گلے لگا کر اس کے پیر زمین پر مضبوط کر دیئے تھے۔ اس کی مما کی پکار نے اس کے وجود کو معنی عطا کیے تھے۔ جانے ان دونوں میں کیا بات ہوئی کہ فاطمہ آپا ہارون کے کمرے سے نکل کر گھر چلی گئی تھیں۔

کھانے کے دوران وہ خاموش تھی۔ ہارون نے بھی کچھ نہیں کہا۔ ہنزر کے سونے کے بعد وہ اپنے لئے چائے بنانے کچن میں آئی اور پھر چائے کا مگ لے کر وہیں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ وہ بڑی دیر سے چائے سے اٹھتی بھاپ کو دیکھ رہی تھی۔ ہارون اس کے سامنے والی کرسی کھینچ کر بیٹھا تو وہ چونکی۔ وہ اسے ڈھونڈتا ہوا کچن میں آیا تھا۔ دونوں چپ رہے۔ صوفی چائے کو اور ہارون اسے دیکھتا رہا۔

''آپا نے جو بھی کہا تھا وہ صرف ان کے خیالات ہیں اور وہ بھی غلط۔'' وہ بلا تمہید شروع ہوا۔ صوفی کو نہیں لگا تھا کہ وہ اسے دیکھ چکا ہے۔

''ان کے خیالات غلط کہاں ہیں۔'' اس نے دونوں ہتھیلیوں کے درمیان مگ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''دنیا میں میرا کوئی سگا رشتہ نہیں ہے، میں......''

''میاں بیوی کا رشتہ میرے خیال میں نکاح کے بعد سے ہی ''سگا'' ہو جاتا ہے۔'' اس کی بات پر وہ لاجواب ہوگئی۔

"یہ مصلحت اور مجبوری کا رشتہ ہے۔"

"مصلحت اور مجبوری دونوں طرف تھی۔"

"اور اب؟" دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لئے ایک ہی سوال تھا لیکن کسی نے نہیں پوچھا۔ تھوڑے توقف کے بعد ہارون نے کہا۔

"مزید غلط فہمیاں نہ بڑھیں اس لیے بہتر ہے ہم کمرہ شیئر کر لیں۔"

"آپ پھر اس وقت کی طرح مصلحت اور مجبوری میں ایک اور غلط فیصلہ کر رہے ہیں۔"

"صوفی!" ہارون نے پکارا لیکن وہ مگ کو ہی گھورتی رہی۔

"صوفی۔" دوسری آواز پر اس نے سر اٹھایا۔

"کیا تمہیں اب بھی وہ فیصلہ غلط لگتا ہے؟" اسے اس سوال کی امید نہیں تھی۔ اس کی نظر جھک گئی۔

"صوفی!" ہارون کی پکار پر اسے دیکھنا پڑا۔

"کیا تمہارے احساسات اب بھی وہ ہی ہیں جو اس وقت تھے؟" ہارون نے اس کی نظر سے اپنی نگاہ الجھا کر سوال کیا۔

"کیا آپ کے وہ ہی ہیں؟" اس نے اپنا جواب سوال میں لپیٹ کر دیا۔

"نہیں۔" ایک مستحکم لفظ پر مگ پہ اس کی گرفت بھی مستحکم ہوگئی۔

"لیکن مجھے وہاں تک پہنچنے کے لئے تھوڑی اور مسافت طے کرنی ہے۔" ہارون نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ صوفی نے اسے دیکھا اور پھر واپس مگ کو دیکھنے لگی۔

"میں یہاں سے کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی، انتظار کر سکتی ہوں۔" اس نے بہت دھیرے سے کہا۔ ہارون پہلی بار مسکرایا۔ کتنی ہی دیر ہارون اسے اور وہ ہنوز مگ کو دیکھتی رہی پھر ہارون نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھوں سے مگ لے لیا۔

"چائے ٹھنڈی ہوگئی ہے۔" وہ کھڑا ہوا۔

"رہنے دیں، مجھے اب چائے نہیں پینا۔" وہ کچن کاؤنٹر کی طرف بڑھا تو صوفی نے جلدی سے کہا۔ ہارون

نے چائے سنک میں بہادی۔ وہ اپنی جلد بازی پر پچھتائی۔ اسے لگا تھا وہ چائے گرم کرنے جا رہا ہے۔

”یعنی حد ہے۔“ اس نے خود کو لتاڑا۔

ہارون نے نل کھول کر پانی سے مگ کھنگالا اور کاؤنٹر پر الٹا رکھ دیا پھر پلٹ کر ٹیبل کے پاس آ کر رکا۔

”فاطمہ آپا کی باتیں صرف ان کے ذہن کی اپج ہیں، مصلحت اور مجبوری میں سہی لیکن وہ فیصلہ غلط نہیں تھا اور میں بہت تیز گام ہوں۔“ وہ ٹیبل پر ہتھیلی ٹیک کر ذرا آگے جھکا۔

”اگر تمہیں سکون سے سونا ہے تو پہلی دو باتیں سوچو اور اگر جاگنا ہے تو تیسری۔“ اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اور شرارت صوفی کے لیے بالکل نئی تھی۔ پھر اسے دھڑکا ہوا کہ سارے بدن سے دوڑ کر چہرے پہ آیا خون کہیں چھلک نہ پڑے۔

”گڈ نائٹ۔“ بڑی گہری نظر اس پر ڈال کر وہ کچن سے چلا گیا۔ صوفی نے سر ٹیبل پر گرا لیا۔

”یا اللہ۔“

ہارون سے ملنے کچھ لوگ آئے تھے۔ وہ کچن میں مصروف تھی۔ اس نے ملازمہ کے ہاتھوں چائے اور ریفریشمنٹ بھجوا دیا۔

”صاب آپ کو بلا رہے ہیں۔“ ذرا دیر بعد ملازمہ نے آ کر کہا۔

”ایسا کون آیا ہے کہ مجھے بلایا۔“ اس نے مائکرو ویو کے دروازے میں نظر آ رہے اپنے عکس کو دیکھ کر بال اور دوپٹہ درست کیا اور ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ وہاں تنویر کو بیٹھا دیکھ اس کے قدم تھم گئے۔ اس کے ساتھ یقیناً اس کے والدین تھے۔ اس کی امی کی نظر اس پر پڑی تو اسے چار و ناچار اندر آنا پڑا۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔“ اس کی امی نے بڑے جوش میں بلند آواز میں جواب دیا۔

”آؤ، بیٹھو بیٹا۔“ تنویر کی امی نے کہا۔ صوفہ پر ان کے بازو میں جگہ تھی لیکن وہ ہارون کی کرسی کے قریب رکھے چھوٹے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

''کئی دنوں سے سوچ رہے تھے آنے کے لیے لیکن ہر مرتبہ......'' اس کے والد کہہ رہے تھے۔لیکن غصہ میں اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔وہ ماموں جان کے انتقال پر افسوس کرنے آئے تھے۔ماموں جان کے جانے کے اتنے مہینوں بعد انہیں آج ہی فرصت ملی تھی۔اس افسوس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے افسوس کا اظہار بھی وہ بڑے کھلے لفظوں میں کر رہے تھے اور وہ تھا ان کا اس وقت تنویر کا نکاح کرنے سے انکار۔اس کے پیچھے چھپا اشارہ اور عندیہ صوفی کو بری طرح طیش دلا رہا تھا۔

''عجیب لوگ ہیں، اب ان باتوں کا کیا مطلب؟'' اس نے سوچا۔تبھی باتوں میں تنویر کی امی نے فاطمہ آپا کا ذکر کیا اور اسے پہلی بار فاطمہ آپا پر بری طرح غصہ آیا۔وہ جو کہتیں وہ کرنے کی بھی قائل تھیں۔

''لیکن کیا یہ لوگ بھی عقل سے پیدل ہیں؟'' غصے کے ساتھ وہ ذرا حیران ہوئی۔

''آپ افسوس نہ کریں۔'' اس کی امی نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ وہ بول پڑی۔''اس وقت آپ کے انکار کے لیے تو میں آپ کی شکر گزار ہوں۔مجھے تو لگا تھا آپ تنویر کی شادی کا انویٹیشن دینے آئے ہیں۔'' مسکرا کر کہے گئے ان جملوں میں چھپا غصہ حاضرین نے ٹھیک ٹھاک محسوس کیا تھا۔تنویر کی امی کے چہرے کی کھسیاہٹ دیکھ کر یہ ہی تاثر فاطمہ آپا کے چہرے پر دیکھنے کی آرزو اس کے دل میں جاگی تھی۔

چند منٹ کے بعد وہ معذرت کر کے واپس کچن میں چلی آئی۔

انہیں گیٹ تک چھوڑ کر ہارون اندر آیا تو وہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر اس کی منتظر تھی۔

''کوئی ڈھنگ کا اسٹوڈنٹ نہیں ہے آپ کے پاس؟'' اس کا اشارہ تنویر اور شغف کی طرف تھا۔ہارون نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی وہ بول پڑی۔

''آپ نے ہی کہا تھا کہ یہ میرا گھر ہے۔'' اس نے ایک بار پھر یاد دلایا۔''اور مجھے اپنے گھر میں ایسے لوگ نہیں چاہیے۔''

ہارون سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔

''کیسے لوگ؟''

''ایسے لوگ جن سے گھر کے امن کو خطرے کا اندیشہ ہو۔''

”اتنا کمزور نہیں ہونا چاہیے تمہارا گھر کہ......“

”میں نے امن کو خطرہ کہا ہے، گھر کو خطرہ نہیں۔“

اس کی گھورتیں نظریں ”امن کو خطرے“ کی کافی اچھی وضاحت کر رہی تھیں۔ کچھ کہنے یا اندر جانے کے بجائے وہ جیبوں میں ہاتھ ڈال کر وہیں جم کر اسے دیکھنے لگا تو صوفی نروس ہونے لگی۔

”اور یہ خطرہ کس شکل میں آئے گا؟“ ذرا توقف کے بعد اس نے مسکراہٹ دبا کر پوچھا۔

”آپ کو آگاہ کرنا میرا اخلاقی فرض تھا، آگے آپ کی مرضی۔“ وہ وہاں رکی نہیں، اندر بڑھ گئی۔ ہارون ضبط کرتے کرتے بھی بالآخر ہنس پڑا۔

❁......❁......❁

وعدے کے مطابق آج اسے ہنزر کی دوست کی سالگرہ میں جانا تھا۔ وہ دونوں ساتھ جا کر اس کے لیے تحفہ خرید لائی تھیں۔ تحفہ پیک کرنے کے بعد انہیں اس پر اصلی پھول اور پتیاں لگانے کا خیال آیا۔ وہ دونوں کچن میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی یہ سارے کام کر رہی تھیں۔ پھول اور پتیاں توڑنے کے لئے وہ کچن کے دروازے سے باہر نکلیں۔ ابھی کون سے پھول اور کونسی پتیاں توڑیں یہی فیصلہ نہیں ہو پایا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔

”چلو۔“ صوفی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر بھاگنا چاہا تو ہنزر نے اسے روکا۔

”تھوڑی دیر بارش میں بھیگتے ہیں۔“

”اچھا۔“ اس نے سر اوپر کیا اور آنکھیں بند کر کے بارش کی بوندوں کا مزہ لینے لگی۔ وہ ہر بارش میں اپنے صحن میں بھیگتی تھی۔ اس بار نہ وہ گھر تھا نہ صحن اس لیے شاید اسے خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اس وقت ہنزر کی بات پر وہ سوئی خواہش جاگ گئی تھی۔ ہنزر نے بھی اس کی نقل کرنا چاہی لیکن سیدھی چہرے پر پڑتی بوندیں اسے برداشت نہیں ہوئیں۔

”آپ کیسے کرتی ہیں؟“ اس نے دوبارہ کوشش کرتے ہوئے صوفی سے پوچھا اور وہ اسے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس دی۔ ہنزر بھی ہنسنے لگی۔

ان دونوں کی آواز پر ڈرائنگ روم میں لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھے ہارون نے باہر دیکھا۔ وہ دونوں اطراف

سے بے خبر بارش کے مزے لے رہی تھیں۔

برسات کے آتے ہی توبہ نہ رہی باقی
بادل جو نظر آئے بدلی میری نیت بھی

اس کی نیت وحسرت کا دخل تھا یا سامنے کا منظر کہ اسے زمانوں قبل پڑھا حسرت موہانی کا یہ شعر یاد آ گیا۔

ایک خیال جو وہ ٹالے جا رہا تھا، ایک تمنا جس سے وہ نظر چرائے جا رہا تھا، وہ خیال اور تمنا جیسے مجسم اس کے سامنے اتر آئے تھے۔ خواہشیں اور تقاضے بھی صوفی کے روپ میں روبرو تھے۔ اس کی زندگی اور گھر میں صوفی کی موجودگی بہت کم دن بے معنی رہی تھی۔ ان دونوں میں شاید پہلے اس کا دل پگھلا تھا، جس سے گھبرا کر اس نے احتیاطی تدابیر کے طور پر صوفی سے وہ سخت باتیں کہی تھیں۔ لیکن وہ دل ہی کیا جو احتیاط سے سنبھل جائے اور دلیلوں سے مان جائے۔ صوفی کی اہمیت اور جگہ تسلیم کرنے کے باوجود بھی وہ خود سمجھنے سے قاصر تھا کہ کون سی چیز اسے اب بھی روکے ہوئے تھی، پھر کسی خسارے کا ڈر، دھوکے اور فریب کا درد، یا پھر صوفی سے مخفی حقائق جو ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے دل پر بوجھ بڑھاتے جا رہے تھے۔

شیشے کے دوسری طرف بارش میں بھیگتی، ہنستی کھلکھلاتی، صوفی کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے آپ سے جنگ اور بحث میں مصروف تھا۔ کچھ دیر بھیگنے کے بعد وقت کا خیال کر کے صوفی اور ہنر چلی گئیں۔ وہ بھی اپنا لیپ ٹاپ بند کر کے کمرے میں چلا آیا۔

ذرا دیر بعد ہنر اور صوفی نہا دھو کر تیار تھے۔ انہیں ڈرائیور کے ساتھ جانا تھا۔

"آپ نے لپ اسٹک تو لگائی ہی نہیں؟" ہنر کے بال بنانے کے بعد آگے آ کر اس کا جائزہ لیتی صوفی کو دیکھ کر ہنر نے کہا۔

"اب رہنے دو، بھول گئی، دیر ہو رہی ہے۔"

"مجھے بھی لگانا ہے۔"

"اچھا، یہاں رکو میں لے کر آتی ہوں۔" صوفی نے اسے صوفے پر بٹھایا اور اپنے کمرے میں آئی۔

ہنر کو جانے کون سا کلر لگانا ہو، سوچ کر اس نے پنک اور پرپل دونوں لپ اسٹک اٹھا لی۔ وہ تیزی سے

ڈرائنگ روم میں جارہی تھی کہ راہداری میں ڈرائنگ روم سے باہر آتے ہارون سے ٹکرا گئی۔ وہ اسے ڈھونڈتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا تھا اور ہنزہ سے ملنے والی اطلاع کے بعد کہ وہ اپنے کمرے میں گئی ہے، وہ صوفی کے کمرے میں جارہا تھا۔ پرانی آہوں پر نئی سرگوشیاں حاوی ہوگئی تھیں، زخم قدیم اور تمنائے مجسم میں آخری الذکر کی جیت ہوئی تھی۔

''سوری۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی مگر یہ کیا، اسے راستہ دینے کی بجائے ہارون اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر یوں آگے بڑھا کہ وہ الٹے قدموں سے چل رہی تھی۔ وہ لڑکھڑائی تو اس نے بازو کمر میں ڈال کر سنبھالا۔ ڈرائنگ روم سے قدرے دور جاکر ہارون نے اس کا لپ اسٹک والا ہاتھ چھوڑا اور اس ہاتھ سے صوفی کا سر تھام کر اوپر کیا، لحظہ بھر اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد وہ نرمی سے اس کے چہرے کے قریب ہوا۔ ایک حدت بھرے لمس کا اثر تھا کہ صوفی کے ہاتھ سے لپ اسٹکس چھوٹ کر زمین بوس ہوئیں اور ان کی جگہ اس کی مٹھی میں ہارون کا شرٹ تھا۔ کچھ پل بعد ہارون نے اپنا چہرہ پرے کیا تو صوفی نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ اپنی ستائیس سالہ زندگی کا یہ پہلا تصادم اسے وقتی طور پر گونگا کرچکا تھا۔

''یہ کسی بھی قسم کا فرض نہیں تھا۔'' وہ اپنی پچھلی بات بھولا نہیں تھا۔ ''اس کے ایک ہی معنی......'' اس کی سرگوشی مکمل نہ ہوسکی۔

''مما!'' ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہنزہ نے پکارا۔ صوفی نے گھبرا کر ہارون کے پیچھے دیکھا، کہیں وہ ادھر نہ آجائے۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ......''

''مما......مما......''

ہارون نے اس کی پیشانی پر اپنی پیشانی ٹکا کر گہری سانس لی اور پھر اسے آزاد کیا۔ صوفی نے سنبھل کر سانسیں درست کیں کہ پل بھر میں درہم برہم ہوئے نظام میں یہی ایک اس کے بس میں تھا۔ ہارون نے جھک کر فرش پر گری لپ اسٹکس اٹھائیں۔

''باقی باتیں رات میں۔'' ہارون نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہتھیلی پر لپ اسٹکس رکھیں۔

''اب تمہیں ان کی ضرورت نہیں۔'' اس لمحے اس کے چہرے پر تصویر والی شوخی اور شرارت تھی۔

''مما!'' ہنزر ڈرائنگ روم کے دروازے پر نمودار ہوئی۔

''ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔'' اس نے باپ کو نظر انداز کر کے صوفی سے کہا۔

''ہاں چلو۔'' وہ ابھی ابھی بیدار ہوئے احساس کو نظر انداز کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ہنزر کے قریب آئی۔

''پہلے لپ اسٹک تو لگا دیں۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنے لگی تو ہنزر نے ٹوکا۔

وہ اپنا سرخ چہرہ چھپانا چاہ رہی تھی جسے ہارون کی نگاہیں مزید تپا رہی تھیں لیکن اب اسے وہیں رک کر ہنزر کو لپ اسٹک لگانی پڑی۔ اس نے بڑی احتیاط سے اسے لپ اسٹک لگائی۔ ذرا دیر پہلے والی واردات سے حواس ابھی تک ٹھکانے پر لوٹے نہیں تھے۔ ایک ذرا سی لرزش سے رنگ کہیں اور پھیل جانا تھا۔

''بائے پاپا۔'' ہنزر نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

''اللہ حافظ بیٹا۔'' ہارون نے آگے آکر کہا۔ وہ اسے بھی کچھ کہتا اس سے پہلے ہی وہ ہنزر کا ہاتھ تھام کر ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

اسے ہنزر کے ساتھ اس کی دوست کے یہاں کم سے کم دو ڈھائی گھنٹہ رکنا تھا کیونکہ وہاں ڈنر بھی تھا اور وہ جانتی تھی ہارون کی طرف سے مزید ایک نظر یا ایک لفظ بھی اسے کسی کام لائق نہیں چھوڑے گا۔

اس کی عجلت جان کر ہارون تنہائی میں ہی ہنس پڑا۔ وہ بڑے موڈ میں اس کی واپسی کا منتظر تھا۔

ان دونوں کی واپسی بہت دیر سے ہوئی تھی۔ حمود اور ہارون کا کھانا ہو چکا تھا۔ ہارون ان دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔ حمود اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ ہنزر تھک گئی تھی اور اسے نیند بھی بہت آ رہی تھی لیکن اسے ہارون کو تقریب کی ساری روداد سنانی تھی۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اس نے شوشہ چھوڑا کہ وہ پاپا سے بات کرتے ہوئے آج انہی کے پاس سوئے گی۔

وہ پلنگ پر پیر سمیٹ کر بیٹھی کبھی گھڑی تو کبھی دروازے کو تک رہی تھی۔ جانے کتنا وقت گزر گیا، تب کہیں دروازے کے باہر راہداری میں قدموں کی چاپ ابھری جو قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ سارے کمرے میں گونجتی

گھڑی کی ٹک ٹک دھک دھک میں بدل گئی۔ ہارون دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ فون کی رنگ ہوئی۔ سناٹے میں گونجتی آواز بند کرنے کے لیے اس نے فوراً فون اٹھایا۔

"ہیلو۔" صوفی نے ہارون کی آواز سنی اور پھر ذرا دیر بعد قدموں کی چاپ دور ہوتی گئی۔ اسے ذرا اندازہ نہیں تھا کہ دور ہوتے یہ قدم اچھا شگن نہ تھے۔ وہ بیٹھی رہی مگر ہارون نہ آیا۔ اس کا انتظار کرتے کرتے بالآخر وہ سوگئی۔

صبح جب پتہ چلا کہ وہ ناشتے سے پہلے ہی سینٹر کے لیے نکل گیا ہے تو اس نے مان لیا کہ رات میں ضرور کوئی بہت اہم فون یا مسئلہ ہوگا جو وہ دروازے سے پلٹ گیا تھا اور پھر اتنی صبح چلا گیا۔ وہ سارا دن اس کا انتظار کرتی رہی۔ اسے یقین تھا کہ وہ کوشش کر کے جلد گھر آئے گا۔ لیکن جلدی تو دور وہ اپنے وقت پر آیا نہ کبھی کبھی کے لیٹ ٹائم پر۔ ہنزہ اور حمود بھی اس کا انتظار کرتے کرتے سو گئے۔ وہ پہلی بار برآمدے کی سیڑھی پر بیٹھی اس کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ہارون آیا اور اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"میں کھانا کھا کر آیا ہوں، تم بھی سو جاؤ۔" ایک نظر اسے دیکھا اور پھر یہ دو ہی جملے بول کر وہ آگے بڑھ گیا۔ صوفی نے بے یقینی سے پلٹ کر اسے اندر جاتے دیکھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے واقعی یہی کہا ہے اور اس نے درست سنا ہے، یہ اس کا وہم یا خواب نہیں ہے۔ کوئی بڑی بات نہ تھی اگر درمیان میں کل کا تصادم نہ ہوتا۔ اس التفات کے بعد نظرانداز کرنے کا مطلب؟ کل تو وہ کسی ایک مطلب و معنی کی بات کر رہا تھا اور اب...... اس کا پرانا غصہ عود کر آیا۔ دل کیا تو مہربان اور مرضی نہ ہوئی تو انجان، یعنی اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ دوسری بار اسے ہارون کے رویے سے شدید ذلت کا احساس ہوا تھا۔ صوفی کا دل کیا ابھی اس کے پیچھے جائے اور کل اور آج کے تضاد کا جواب مانگے، اسے "باقی باتوں" کا وعدہ یاد دلائے۔ کوئی جھگڑا ہی نہ رہے اگر انسان انا اور خودداری کو طاق پر رکھ کر فوراً سوال و جواب کر کے معاملہ اسی وقت ختم کرنے لگ جائے۔ اسے بھی انا نے آگے بڑھنے سے روکے رکھا تھا۔ اسے خود پر بھی غصہ آنے لگا کہ کیا ضرورت تھی میدان میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے کی۔ وہ تپتی، جھلستی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ ساری رات کروٹیں بدل بدل کر گزری۔ بڑی دیر تک غائبانہ اسے باتیں سناتے اور کٹہرے میں کھڑا کرنے کے بعد آخر اس نے یہی طے کیا کہ صبح پہلے ہارون سے

بات کرے گی۔ اپنے پہلے اور آج والے غصے کا واضح فرق بھی اسے سمجھ آ گیا تھا۔ اس دفعہ کمبخت دل کی دلیلیں بھاری پڑ رہی تھیں جو پہلے چپ رہتا تھا۔

سارے باندھے ارادے صبح دھرے کے دھرے رہ گئے۔ وہ آج بھی ناشتہ کیے بغیر یعنی اسے شکل دکھائے بغیر ہی چلا گیا تھا۔

''کیا واقعی اتنا کام ہے؟'' اس نے سوچا۔ ''اگر ایسا ہے تو یہی بات کہی بھی تو جا سکتی ہے کہ مصروف ہوں۔''

اس کا پورا دن پھر بے چینی سے رات کا انتظار کرنے میں گزر گیا۔ وہ دیر سے آیا اور کھانے کے دوران پھر اسے نظر انداز کر کے وہ دونوں بچوں سے دن بھر کی روداد سنتا رہا۔ کھانا ختم ہوتے ہی بچوں کے ساتھ ہی وہ بھی اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ وہ کچن سمیٹ کر باہر نکلی اور کتنی ہی دیر اس کے کمرے کے باہر دروازے کو گھورتی رہی۔ دھڑا دھڑ اس کا دروازہ بجانے کی خواہش دبا کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

پھر یہی اس کا معمول ہو گیا۔ وہ صبح ناشتہ کے بغیر ہی چلا جاتا اور رات میں دیر سے لوٹتا۔ کھانے کے ٹیبل پر وہی معمول کی گفتگو، اس دوران اسے بھی مخاطب کر لیا جاتا۔ وہ بھی بچوں کی خاطر غصہ دبائے جواب دے دیتی۔

اس کا غصہ بھی جیسے نقطہ عروج پر پہنچنے کے بعد اپنی آب کھو چکا تھا۔ اس کی جگہ اب تشویش تھی۔ وہ اسے نظر انداز کر رہا تھا یا اس سے کترا رہا تھا؟ اس کے چہرے پر درج تناؤ اور ماتھے کی شکنیں اسے فکر مند کرنے لگی تھیں۔ اس کی الجھن اور پریشانی وہ بھی محسوس کر رہی تھی۔ کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ وہ یہ سوچ سوچ کر پاگل ہونے کو تھی۔ کیا فاطمہ آپا کی طرف سے کوئی مسئلہ ہے؟ تنویر والی کوئی بات؟ وہ دیکھ چکی تھی کہ ہارون کے لیے فاطمہ آپا اہم تھیں ان کی بے سروپا باتوں اور بیجا فرمائشوں کو وہ اہمیت نہیں دیتا تھا، پھر بھی سن گن لینے کے لیے اس نے پہلی بار انہیں بھی فون کر لیا۔ انہوں نے عام سے انداز میں بات کی، جس سے ان کی طرف سے کسی مسئلہ کا اشارہ نہیں ملا تھا۔ قیاس کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے اس نے صفوان کو بھی فون کیا کہ شاید بھیونڈی سے کسی ایسی بات کا سراغ مل جائے مگر بے سود۔ آخر کو خیال کی سوئی اس کے کام پر آ کر ٹھہر جاتی۔

''لیکن کام کی پریشانی میں میرا کیا قصور؟ مجھے سزا کیوں؟''

اس دوران چھٹی کے دو دن بھی وہ سینٹر گیا تھا۔ حمود اور ہنزہ کے پوچھنے پر اس نے کام کی زیادتی کو ہی وجہ بتایا

تھا۔لیکن اب صوفی کا دل یہ وجہ قبول کرنے کو بھی تیار نہیں تھا۔

کل سنیچر تھا اور کھانے کے دوران ہنزہ نے اس کے دل کی بات کہہ دی۔

''پاپا، کل آپ آفس نہیں جانا۔''

''کیوں بیٹا؟''

''لاسٹ سیٹرڈے سنڈے بھی آپ گھر پر نہیں تھے۔''

''سوری بیٹا لیکن کام بہت ہے۔''

''کیا آپ کا پروجیکٹ مکمل ہونے کے قریب ہے؟'' حمود نے انگریزی میں سوال کیا۔

''جلد ہی، انشاءاللہ۔''

''تو کیا اس کے بعد ہم یو ایس یا آسٹریلیا واپس جائیں گے؟''

''ابھی اس تعلق سے کچھ طے نہیں ہے۔''

''یہاں آنے سے پہلے آپ نے یہی کہا تھا، پروجیکٹ مکمل ہونے کے بعد ہم واپس چلے جائیں گے۔''

''دیکھیں گے، ابھی کچھ سوچا نہیں ہے۔''

''لیکن پاپا......''

''حمود۔'' ہارون کی آواز قدرے اونچی اور غصیلی تھی۔ سب سہم گئے۔ یہ پہلی بار ہی ہوا تھا۔

''یہ سب آپ کے فکر کرنے اور سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔'' اب کے اس نے انگریزی میں ہی مگر نرمی سے کہا۔''ابھی پروجیکٹ مکمل ہونے میں وقت ہے۔''

''او کے۔'' حمود اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔

اس کے بعد پھر کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ سب سے پہلے حمود اٹھا، اس کے بعد ہنزہ اور ہنزہ کے ساتھ ہارون بھی۔ وہ پہلے ہی کہہ چکی تھی آج اسے ہارون کے پاس سونا ہے۔

سب کے جانے کے بعد وہ بڑی دیر تک سوچوں کے گرداب میں پھنسی یوں ہی بیٹھی رہی۔ صاف ظاہر تھا کہ کوئی بات اسے پریشان کر رہی تھی۔ اس رات دروازے کے باہر کس کا فون تھا اور ایسا کیا کہا گیا کہ اس تک پہنچا

ہارون پل بھر میں اتنا دور چلا گیا تھا؟ اسے ہارون کے رویے میں اپنے لیے غصہ یا ناراضی نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ وہ خود میں ہی الجھا محسوس ہو رہا تھا۔ حمود اور اس کی گفتگو کے بعد ماحول یکسر بدل گیا تھا۔ اس کے بعد ٹیبل پر بیٹھے وہ چار نفوس بالکل خاموش تھے۔ فضا میں پھیلا تناؤ اور سناٹا بڑا واضح تھا۔ گھر میں یہ تناؤ اور سناٹا مستقل نہ ہو جائے اس کی فکر کرنا اس کی ذمہ داری تھی اور ہارون کو یوں تنہا نہ چھوڑنا اس کے دل کی مجبوری۔ وہ اٹھی اور کچن سمیٹ کر ہارون کے کمرے میں پہنچی۔

دروازہ کھلا تھا۔ ہارون کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ آہٹ پر اس نے پلٹ کر دیکھا، لمحہ بھر کو اس کی آنکھوں میں حیرت ابھری، پھر وہ دوبارہ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ صوفی آہستہ چل کر اس کے پیچھے ذرا فاصلے پر رک گئی۔ وہ بے چینی سے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ دماغ اسے سمجھا رہا تھا کہ بہت ممکن ہے اسے پچھلی بار کی طرح ذلیل اور بے عزت کر کے کمرے سے نکال دیا جائے، اس لیے بہتر ہے، وہ خود ہی وہاں سے چلی جائے۔ لیکن وہ اس مقام پر پہنچ گئی تھی جہاں دل کی دہائیوں میں دماغ کے مشورے گم ہو جاتے ہیں۔

''ہماری پہلی ملاقات کو تقریباً ڈیڑھ سال ہونے آیا ہے۔'' ہارون کی پشت کو دیکھتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔ ''شناسائی سے اس...... تعلق تک کے سفر میں، ایک دوسرے کے لئے ناپسندیدگی، ناگواری ہو یا پھر مصلحت اور مجبوری، اور...... اگر میں غلط نہیں ہوں تو اس کے بعد اپنائیت اور انسیت بھی، ہم نے سب...... ایک ساتھ سہا، نبھایا اور محسوس کیا ہے۔'' وہ لمحہ بھر کو رکی۔ ''آپ نے ماموں جان کی بیماری کے دوران مورل سپورٹ دیا، جب میں خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی تب کمرے میں ٹھہر کر میرا ساتھ دیا اور روتے کو کاندھا دینے والا انسانی فرض بھی نبھایا، غرض ہر مشکل ترین وقت میں آپ نے میرا ساتھ دیا، مجھے تنہا نہیں چھوڑا اور اب......'' وہ دو قدم چل کر آگے آئی۔ ''مجھے الگ کر کے آپ اس ان کہے معاہدے کے ساتھ بے ایمانی کر رہے ہیں۔ آپ اپنی پریشانی مجھ سے بانٹنا نہیں چاہتے، مجھے اپنے مشکل وقت میں شامل نہیں کرنا چاہتے، لیکن میرا ساتھ دینے کا حق تو نہ چھینیں۔'' وہ مزید ایک قدم اٹھا کر عین اس کے پیچھے کھڑی ہوئی، انگلیاں ایک دوسرے سے آزاد کیں اور دونوں طرف سے اس کی شرٹ پکڑا۔ ''اور اگر یہ میری سزا ہے تو کم از کم میرا قصور ہی بتا دیں۔'' اس نے اپنی پیشانی ہارون کی پشت پر ٹکائی۔

وہ ہارون کے کچھ بولنے کی منتظر تھی۔ لمبا ہوتا خاموشی کا دورانیہ اسے مایوس کر رہا تھا۔ اس کی انا اور عزت نفس، فکر کے آگے ڈھے گئی تھیں۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس دروازے سے اندر آئی تھی اور اب اسے ڈر تھا کہ اس پہل کے جواب میں سرد مہری دائمی فاصلوں کی وجہ بن سکتی ہے۔ اس نے مٹھی میں ہارون کا ٹی شرٹ نہیں اپنی آخری امید پکڑ رکھی تھی۔

دفعتاً ہارون نے اپنا سیدھا ہاتھ جیب سے نکالا اور صوفی کا بایاں ہاتھ کھینچ کر آگے اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ اب بھی جیب میں تھا۔

کون اپنی مرضی اور خوشی سے تنہا رہنا چاہتا ہے۔ سارا فساد ہی یہ تھا کہ چند مہینوں کے اس ساتھ کے بعد وہ پھر تنہا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ سینے پر دھری ہتھیلی پر ہارون کی مضبوط گرفت صوفی کی تسلی کے لیے کافی تھی۔ اپنا گال اسکی پشت پر رکھتے ہوئے صوفی کے دل کو قرار آ گیا تھا۔

باپ کی الجھن دور کرنے کی نیت سے آیا حمود، کھلے دروازے سے اندر کا منظر دیکھ کر واپس پلٹ گیا۔ ہارون کو ہی نہیں فیصلہ اسے بھی کرنا تھا۔ اسی کشمکش میں وہ رات بھر سو نہیں پایا۔

اگلی صبح ہارون ناشتے کی میز پر موجود تھا۔ اس کے پچھلے دنوں کے معمول کے مدنظر، ان تینوں کے لیے یہ خوشگوار تبدیلی تھی۔ اس نے حمود اور ہنر سے ہی باتیں کیں پھر بھی اب اسے اپنا نظر انداز کیا جانا برا نہیں لگ رہا تھا۔ حمود اور ہنر کے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ ان دونوں کا ٹفن تیار کر رہی تھی۔ وہ دونوں اپنے اسکول کی تیاری کرنے کمروں میں جا چکے تھے۔

''صوفی!'' ہارون کی آواز پر وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔ کتنے دنوں بعد اس نے پکارا تھا۔ وہ کچن کے دروازے میں کھڑا اسے آواز دے کر اب سوچ رہا تھا۔

''جی؟'' صوفی نے جیسے جی کہہ کر اس کا حوصلہ بڑھایا۔ ''کہہ دیں، سوچیں نہیں۔''

''میں شام میں جلد آؤں گا، کہیں باہر چلتے ہیں۔'' یہ قطعی متوقع نہیں تھا۔ وہ صرف سر ہلا سکی۔

''تیار رہنا، اللہ حافظ۔''

وہ پلٹ کر چلا گیا۔

”کیا یہ اتنے دنوں سے رواں بے رخی کی تلافی ہے، یا ایک نئی شروعات؟“ صوفی نے سوچا۔”یا پھر وہ اپنی پریشانی کی وجہ شیئر کرنا چاہتے ہیں؟ جو بھی ہو، مجھے تینوں منظور ہیں۔“

حمود اور ہنزر کے اسکول جانے اور کچن سے فارغ ہونے کے بعد وہ شام کی تیاری کے ارادے سے اپنے کمرے میں آئی۔ اس کے ذہن میں مختلف خیالات اٹھ رہے تھے کیونکہ ہارون کے ساتھ باہر جانے کا یہ پہلا موقع تھا، دوسرے جس قسم کے حالات میں اس نے ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ اس کے اندر جوش بھی تھا اور گھبراہٹ بھی، جانے ہارون اسے کیا کہہ دے۔ اس نے بے اختیار دعا کی کہ یہ مہربانی کسی بری خبر کی تمہید نہ ثابت ہو۔

اس نے ابھی کپڑوں کا انتخاب بھی نہیں کیا تھا کہ لینڈ لائن پر حمود کی سکول سے فون آ گیا۔ بارہ بجے پرنسپل نے والدین کو ملنے بلایا تھا۔ بڑی دیر تک غور و خوض کے بعد کہ اسے یہ اطلاع ہارون تک پہنچانی چاہیے یا نہیں، بالآخر اس نے خود ہی اسکول جانے کا فیصلہ کیا۔ ملازمہ کو اپنے واپس آنے تک رکنے کو کہا، کیونکہ پتا نہیں تھا اسے اسکول میں کتنا وقت لگے گا۔ اس دوران ہنزر اسکول سے آئے تو گھر میں کسی کا موجود ہونا ضروری تھا۔ آج اس کی ڈرائنگ کلاس کا دن تھا۔ ملازمہ کو ڈرائیور کے ساتھ جا کر ہنزر کو اسکول سے لانے، کھانا کھلا کر پھر ڈرائنگ کلاس کے لیے ڈراپ کرنے کی تاکید کر کے وہ حمود کے سکول کیلئے نکل گئی۔

حمود کی بے شمار تعریفوں کے بعد پرنسپل نے اس کی جو شکایت کی۔ اسے سن کر اس کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔ ذمہ دار اور پابند حمود نے پچھلے ایک ہفتے میں بغیر پیشگی اطلاع کے اسکول سے تین دن کی چھٹی کی تھی۔ وہ روز اپنے وقت پر ڈرائیور کے ساتھ اسکول جا رہا تھا اور اپنے وقت پر ہی ڈرائیور کے ساتھ لوٹ رہا تھا۔ اسکول کا مثالی طالب علم ہونے اور پہلے اس قسم کا کوئی ریکارڈ نہ ہونے کی بنا پر، پہلی دو چھٹیوں پر کلاس ٹیچر نے رعایت دے دی تھی۔ لیکن وہ آج پھر بغیر کسی اطلاع کے غائب تھا۔ بطور سرپرست پرنسپل یا ٹیچر سے ملنے کا اس کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اپنے طور پر پرنسپل کی یقین دہانی کر کے وہ باہر چلی آئی۔

”تو کیا ہارون کی پریشانی کی وجہ حمود ہے؟ اسے تو حمود میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی تھی، یا پھر میں ہارون کے رویہ میں اس قدر الجھی تھی کہ اس نے غور ہی نہیں کیا۔ حمود کیوں اسکول سے غائب تھا؟ وہ اسکول سے چھٹی کر کے کہاں جا رہا تھا؟ کیا وہ کسی سے مل رہا تھا؟ اسے اس طرح چوری چھپے کس سے ملنا تھا اور کیوں؟ ہارون

کے ڈانٹنے کی وجہ سے کیا وہ ناراض ہے؟ لیکن یہ تو کل کی بات ہے، جبکہ حمود آج سے پہلے بھی دو بار چھٹی کر چکا ہے، کیا کل ہارون کا غصہ اسی وجہ سے تھا کہ اسے حمود کی اس حرکت کا علم ہے؟ حمود نے کیوں کل پروجیکٹ ختم ہونے اور یہاں سے جانے کا ذکر چھیڑا؟ کیا یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے جڑی ہیں؟'' سوال ہی سوال تھے۔

وہ اسکول کے گیٹ سے باہر آ کر سڑک کے دوسری طرف بنے بس ٹاپ پر بیٹھ گئی۔ جہاں سے اسکول کے گیٹ تک پہنچنے والے سارے راستے اس کی نظر میں تھے۔ حمود روز ڈرائیور کے ساتھ گھر آ رہا تھا۔ یعنی وہ جہاں بھی جاتا تھا، چھٹی کے وقت ڈرائیور کو اسکول کے گیٹ پر ہی ملتا تھا۔

''کیا وجہ ہے کہ گھر میں بتائے بغیر حمود اسکول کا وقت، کہیں اور، کسی کے ساتھ، یا کسی کام میں گزار رہا ہے، کیا وہ فاطمہ آپا سے ملنے جا رہا ہے؟ لیکن کیوں؟ اور اگر ایسا ہے بھی تو اس میں چھپانے والی کیا بات ہے؟ ہو سکتا ہے فاطمہ آپا اسے میرے خلاف استعمال کر رہی ہو، اسے میرے خلاف بھڑکا کر، اسے مجھ سے متنفر کر کے، مگر کس طرح؟ کیسے؟ لیکن حمود ایسا بچہ نہیں ہے کہ کسی کی بھی باتوں میں آ جائے۔ کیا وہ کسی غلط صحبت میں پڑ گیا ہے؟ یا کسی بری عادت میں ملوث ہے؟'' بیسوں امکان تھے، لیکن جتنا وہ حمود کو جانتی تھی اسکی بناء پر کسی ایک بھی وجہ پر اس کا دل راضی نہیں ہو رہا تھا کہ ہاں، شاید یہی بات ہو۔

اسے مستعدی سے ہر راستے پر نظر رکھے، ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہونے آیا تھا۔ اس دوران اس نے گھر فون کیا تھا۔ ہنزا اسکول سے آ گئی تھی اور کھانے کے بعد ملازمہ، ڈرائیور کے ساتھ اسے کلاس کے لیے لے جا رہی تھی۔

اسکول ختم ہونے کے پندرہ منٹ پہلے ادھر ادھر نظر دوڑاتی صوفی کو آخر حمود نظر آیا۔ وہ اسکول کی عمارت سے ذرا فاصلے پر کافی شاپ کے باہر کھڑا تھا۔ وہ یہیں تھا، اسکول کے بغل میں۔ وہ کسی سے بات کر رہا تھا۔ کافی شاپ کے گیٹ کے باہر رکھے بڑے بڑے گملوں کی گھنی جھاڑیاں اس کے لئے رکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔ اندر کھڑا شخص اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ذرا دیر بعد ایک ہاتھ آگے آیا، حمود کا گال تھپتھپانے کے بعد حوصلہ دیتے انداز میں اس کا شانہ دبا کر وہ ہاتھ واپس اندر چلا گیا۔ اس زنانہ ہاتھ کی کہنیوں سے ذرا نیچے تک پیلی آستین تھی اور سلور رسٹ واچ یا بریسلیٹ دور سے ہی چمک رہا تھا۔ حمود ہاتھ ہلا کر اسکول کی طرف بڑھ گیا۔ وہ تیزی سے

اٹھی اور حمود کہاں اور کدھر جا رہا ہے بھول کر بس اسٹاپ کے فٹ پاتھ پر چلتی اس کافی شاپ کی طرف بڑھی۔ کافی شاپ کے سامنے پہنچ کر اس نے سڑک عبور کی اور جیسے بھاگ کر اندر پہنچی۔ اندر دو ٹیبل پر دو لڑکے تھے اور دوسرے پر ایک مرد اور عورت۔ عورت کے ٹاپ کی پوری آستینیں سیاہ تھیں۔ اس کے علاوہ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ پیلی آستین کافی شاپ سے باہر نہیں نکلی تھی اس کا اسے یقین تھا۔ وہ ریسیپشن پر پوچھنے کے ارادے سے پلٹی اور ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ واش روم سے باہر نکل رہی تھی۔ اس نے صرف دو چار تصویریں دیکھی تھیں، لیکن اسے پہچاننا اس لیے مشکل نہ تھا کہ ہنر ہو بہو اس کی کاپی تھی۔ رہام نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ وہ دونوں آمنے سامنے ساکت کھڑی تھیں۔

رہام پہلے ہوش میں آ کر آگے بڑھی۔

"صوفی!" اور صوفی جو پہلے ہی مرنے کی حد تک حیران تھی، دو قدم پیچھے ہٹی۔

"حمود رہام سے مل رہا تھا مطلب وہ جانتا تھا کہ رہام زندہ ہے یا پھر اسے اب علم ہوا کہ اسکی ماں۔"

"صفیہ۔" رہام کی آواز پر وہ لڑکھڑا کر سنبھلی۔

"آپ مجھے......" عمر بھر کی حیرانیاں اور انکشافات شاید آج کے دن کے لیے مخصوص تھے۔

"حمود جب اس سے مل ہی رہا تھا تو اسے میرے متعلق بتانا، میری تصویر دکھانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، بڑی بات تو......" ایک نیا خیال آتے ہی اس کی سوچ دم توڑ گئی۔ ایک بار پھر اس کا غصہ پورے طمطراق سے جاگا تھا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر پلٹی۔

"صفیہ۔" رہام لپک کر اس کے پیچھے بھاگی۔ "صفیہ! میری بات سنیں پلیز۔" دروازے سے باہر رہام نے اس کا راستہ روکا۔

"آپ سے نہیں مجھے فی الحال کسی اور سے سننا ہے۔" سپاٹ لہجے میں کہہ کر وہ رکی نہیں۔ گیٹ سے باہر آتے ہی سامنے سے گزرتی ٹیکسی کو روکا اور فوراً اندر بیٹھ گئی۔

رہام نے بے قراری سے ہونٹ کاٹتے ہوئے دور جاتی ٹیکسی کو دیکھا پھر کچھ سوچ کر بیگ سے موبائل نکالا اور ہارون کو فون لگایا۔ وہ اتنی باخبر تو تھی کہ جانتی تھی صوفی کو اس کے متعلق سب کچھ نہیں معلوم ہے۔

وہ گھر پہنچی، اس کے چار پانچ منٹ بعد حمود بھی پہنچ گیا تھا۔ وہ غصے سے بھری اپنے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ منتشر ذہن ڈھنگ سے کچھ سوچ بھی نہیں پا رہا تھا۔ دل و دماغ میں ''اتنا بڑا دھوکا، اتنا بڑا جھوٹ۔'' کی تکرار جاری تھی۔ فون کی رنگ پر اس نے فون اٹھایا۔ ''ہارون کالنگ'' دیکھ کر اسے ایک اور جھٹکا لگا۔

''میں نے کب یہ نمبر سیو کیا اور انہیں اپنا نمبر دیا؟'' اس نے فون رسیو کیے بغیر ہی پلنگ پر اچھال دیا۔

''مجھ سے بڑا بے خبر بھی کوئی ہے دنیا میں۔''

''کیا یہ سچ بتانے کیلئے مجھے باہر چلنے کو کہا تھا یا پھر یہ التفات پردہ ڈالنے کی ایک اور کوشش تھی۔'' وہ مسلسل کمرے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چل رہی تھی۔

''میں اتنی بے وقوف ہوں یا وہ اتنے شاطر۔ ایسا فریب، ایسا دھوکا۔ کون یقین کرے گا۔ کبھی شک تک نہ ہوا۔''

فون دوبار رنگ ہو کر اب خاموش تھا۔ اس کے اندر اٹھ رہے سوال غصے کو مزید ہوا دے رہے تھے۔

جانے کتنا وقت گزر گیا تھا، جب دستک دیے بغیر دروازہ کھول کر ہارون اندر آیا۔ صوفی کو دیکھتے ہی ایک گہری سانس لے کر اس نے خود کو سنبھالا۔ رہام کے فون کے بعد، سینٹر سے گھر پہنچنے کی تیزی اور عجلت اس کی حالت سے ظاہر تھی۔

''صوفی!'' وہ اس کے مقابل آیا اور صوفی جو پیچھے ہٹ کر اس سے دور ہونا چاہتی تھی، اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ اسے سامنے دیکھ کر غصے کے ساتھ ساتھ اب تکلیف اور درد کا احساس بھی جاگ گیا تھا۔

''کیوں اتنا بڑا جھوٹ کہا آپ نے؟'' وہ تو صرف غصے میں تھی لیکن جب کہا تو اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

''میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں کہا ہے۔'' ہارون نے اسے شانوں سے تھاما۔ جو بات اس سے کہنا بہت مشکل لگ رہا تھا وہ یوں کھلی تھی کی اب کہے بنا چارہ نہ تھا۔

''آپ اب بھی......''

''یاد کرو صوفی۔ اچھی طرح یاد کرو۔ میں نے کب کہا تھا کہ رہام اس دنیا میں نہیں ہے؟ بلکہ میں نے کب رہام کا ذکر کیا؟ تم سے یا سر سے یا اور کسی سے، تم نے کب مجھے رہام کے تعلق سے کچھ کہتے دیکھا یا سنا؟''

غصہ کے بادل پرے دھکیلتے ہوئے اس نے کھلی فضا میں غور کیا......دور......دور تک غور کیا، ہارون ٹھیک کہہ

رہا تھا۔ وہ مزید الجھ گئی۔

"قریبی اور ضروری، سبھی لوگوں کو رہام اور میرے علیحدگی کا علم ہے، اماں تو رہیں نہیں، ان کے علاوہ فاطمہ آپا کی فیملی اور حمود کو ساری حقیقت پتہ ہے کہ رہام زندہ ہے اور یو ایس میں ہے، ہنزہ چھوٹی تھی اس لیے وہ حقیقت نہیں جانتی، اس کے مطابق اس کی ممی اس دنیا میں نہیں ہے۔" وہ اس انکشاف پر جتنا حیران ہوتی کم تھا۔

"یہاں آنے کے بعد جب کسی نے وائف کا پوچھا اور میرے چہرے پر ابھرے تاثر سے اس نے خود ہی ایزیوم کر لیا کہ وہ فوت ہو چکی ہے، پھر یہ بات ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک ہوتی آگے یوں ہی پہنچتی رہی۔ میرا قصور یہ ہے کہ میں نے نہ پہلی بار تصحیح کی نہ اس کے بعد، اور سچ کہوں تو مجھے یہ زیادہ مناسب لگا تھا کہ لوگ اسے مردہ سمجھے۔"

آج کا سورج صرف اسے حیران کرنے کے لیے طلوع ہوا تھا۔

"صوفی!" ہارون نے اس کے نم گالوں پر انگلی پھیری۔ "رہام اور میری طلاق ہو چکی ہے، میرے لئے اس کا ہونا نہ ہونا، دونوں برابر ہے۔"

رہام پر نظر پڑنے کے بعد سے اب تک، پہلی بار اس نے اپنے اندر پھیلے خلفشار کو زائل ہوتا محسوس کیا۔

"پھر وہ کیوں۔"

"یہاں آؤ۔" ہارون نے اس کی بات قطع کی اور ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

"میرے پی ایچ ڈی کے دوران میں جس علاقے میں رہتا تھا، وہاں رہام کی فیملی کا چھوٹا سا ایشین سپر اسٹور تھا، وہ تینوں بہنیں والدین کا ہاتھ بٹانے وہاں آتی رہتی تھیں، وہیں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہماری دوستی ہوئی، پھر محبت اور اس کے بعد شادی۔ جاب کے بعد میں مصروف ہو گیا۔ اماں، رہام، حمود اور ہنزہ کے ساتھ میرا گھر، میری زندگی مکمل تھی، اپنی محبت، اپنا یقین اور اپنا گھر، سب رہام کی سپرد کر کے میں مطمئن تھا لیکن ایک دن ثابت ہوا کہ میں دراصل غافل تھا۔"

اسے آج بھی وہ رات یاد تھی۔

آنکھ کھلنے پر رِہام کی جگہ خالی پا کر وہ اٹھا تھا۔ بالکنی کے دروازے سے اس کی نائیٹی لہرائی تو وہ اٹھ کر بالکونی کی طرف آیا، رِہام فون پر محوِ گفتگو تھی۔ وہ انگریزی میں بات کر رہی تھی۔

”تم سمجھو پلیز۔ میں اچانک نہیں کہہ سکتی یہ بات۔ مجھے ماحول بنانا پڑے گا، کچھ تو تمہید باندھوں پہلے۔ میں اکیلی ہوتی تو کب کا معاملہ ختم کر دیتی لیکن میرے بچے ہیں سرمد، ان کی خاطر مجھے صبر اور سمجھداری سے بات کرنی ہے۔ ہاں میں جانتی ہوں۔ اس کے لئے تمہاری ممنون بھی ہوں۔ نہیں، پلیز تم ایسا کچھ مت کرنا۔ نہیں تم ہارون سے نہیں ملو گے۔ میں خود ہی یہ معاملہ نپٹاؤں گی۔ ہاں، وہ دے دے گا، اس کے پاس وقت کہاں ہے کہ وہ بچے سنبھالے۔ نہیں سوال ہی نہیں۔ میں کسی قیمت پر اپنے بچے نہیں چھوڑ سکتی۔ ہم۔ ٹھیک ہے۔ رکھتی ہوں۔ ہاں، کل...... گڈ نائٹ۔“

وہ فون بند کر کے وہیں کھڑی رہی اور ہارون خود کو گھسیٹتا واپس پلنگ تک آیا تھا۔ اس کی محبوب بیوی کی یہ باتیں اگر کوئی تیسرا اس سے منسوب کر کے کہتا تو دنیا ادھر کی ادھر ہو جاتی لیکن وہ یقین نہ کرتا اور اب اپنے کانوں سے سن کر واقعی اس کی دنیا ادھر کی ادھر ہو گئی تھی۔ وہ ذہین و فطین مانا جانے والا بندہ محبت کے معاملے میں احمق ترین ثابت ہوا تھا۔

رِہام کمرے میں آئی تو اسے بیٹھا دیکھ کر بری طرح ٹھٹکی۔

”ہا...... رون......“

اس نے شعلہ بار نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کر جھٹکے سے الماری کے پٹ کھولے۔

”اپنا سامان لو اور ابھی اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔“ اس کی آواز دھیمی مگر لہجہ نفرت سے پُر تھا۔ کیا یوں پل بھر میں محبت نفرت میں بدل سکتی ہے؟ کیا ایک جذبہ کی موت پر اسی پل اس کا متضاد جذبہ پیدا ہونا ممکن ہے؟

”ہارون! پلیز سکون سے میری بات سن لو پہلے۔“ وہ لجاجت سے کہتے ہوئے اس کے قریب آئی۔

”تمہاری ہی بات سنی ہے رِہام۔“ اس کا لفظ، لفظ برف تھا۔ رِہام رونے لگی۔

”اس ڈرامے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ہارون نے خود ہی اس کے کپڑوں کے ہینگر نکال کر پلنگ پر پھینکنے شروع کیے۔

''اپنی اور میری انرجی برباد مت کرو اور جاؤ وہاں جہاں تمہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے کپڑوں کے بعد بیگ گھسیٹ کر پلنگ پر رکھا اور کھول کر اس میں کپڑے ڈالنے لگا۔

''ہارون، ہارون! پلیز۔'' رہام نے آگے آ کر اس کا ہاتھ پکڑا، ہارون نے اتنی زور سے اس کا ہاتھ جھٹکا کہ وہ گرتے گرتے بچی۔

''اگر تم چاہتی ہو کہ میں کوئی انتہائی قدم نہ اٹھاؤں، تو اسی وقت میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔'' اس نے سارے کپڑے ٹھونس کر بیگ بند کر کے فرش پر کھڑا کیا پھر رہام کو بازو سے اور بیگ کو ہینڈل سے گھسیٹ کر دروازے تک لایا۔

''آئندہ ادھر کا رخ مت کرنا، جو تمہیں چاہیے تم تک پہنچ جائے گا۔'' ہارون سے خود کو چھڑا کر وہ کمرے کے وسط میں آئی۔

''کیا؟'' اسے اس قدر طیش میں یہ فراخدلی۔ اسے یقین نہ آیا۔

''تم حمود اور ہنزہ۔''

''نام مت لو بچوں کا اپنی زبان سے۔'' وہ غضب ناک ہو گیا تھا۔ ''طلاق کے پیپرز پہنچ جائیں گے۔''

''اور میرے بچے؟'' وہ رو رہی تھی۔

''آج سے وہ صرف میرے بچے ہیں۔''

''ہارون!'' اسے ہارون سے اس قدر سفاکی کی امید بھی نہیں تھی۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو میں بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''میں تو یہ بھی جانتا تھا کہ تم میرے بغیر نہیں جی سکتی۔''

''ہارون پلیز۔'' اس نے گڑگڑا کر کہا۔ ''بیوی اور ماں کی محبت میں فرق ہوتا ہے۔''

''محبت کیسی بھی ہو وفا کے بغیر وہ گالی ہے، جیسے تم......''

''ہارون۔'' رہام نے اونچی آواز میں پکار کر اسے آگے کہنے سے باز رکھا۔

''توجہ اور وقت کے بغیر بھی محبت صرف زبانی جمع خرچ ہے۔''

”تو توجہ اور وقت مانگنے یا کمی کی شکایت کرنے کی بجائے دوسری محبت ڈھونڈ لینا کیا ہے؟“

”میں نے تمہارے ساتھ غلط کیا، تمہیں چیٹ کیا، اس لئے ریئلی سوری۔ معافی مانگتی ہوں تم سے۔“ وہ زہریلے انداز میں ہنسا۔

”غلطی اور چیٹنگ جیسے الفاظ استعمال کر کے اپنے کیے کو معمولی مت بناؤ، تم نے قتل کیا ہے، محبت کا، یقین کا، رشتے کا، گھر توڑنے کا عظیم گناہ کیا ہے تم نے۔“

”تمہارے سارے الزام قبول ہیں، لیکن گھر توڑنے کی ذمہ دار تنہا میں نہیں ہوں، ہارون۔“

”راستہ تم نے بدلا ہے میں نے نہیں۔“

”اس دوراہے پر تم مجھے لائے ہو، تم نے مجھے اس جگہ پہنچایا جہاں مجھے دوسرا راستہ نظر آ رہا تھا۔“

”اب تم لفاظی سے اپنے قدم کو درست ٹھہراؤ گی؟“

”میں کب کہہ رہی ہوں کہ میں صحیح ہوں، میں اپنی خطا مانتی ہوں، تمہیں حق ہے مجھے عمر بھر معاف نہ کرو، لیکن غور کرنا کبھی سارا دوش میرا نہیں نکلے گا۔“

”تم اس طرح کی باتیں کر کے خود کو بولڈ اور نڈر ثابت کرنا چاہ رہی ہو، لیکن یہ خالص بے شرمی ہے، اب جاؤ۔“ ہارون نے اس کا بازو پکڑ کر پھر دروازے کی سمت دھکا دیا۔

”ہارون! میں ہنزا اور حمود کو لیے بغیر نہیں جاؤں گی۔“ اب کے اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

”یہ تمہیں دوسرا آپشن چوز کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ ہنزا اور حمود میں تمہیں کبھی نہیں دوں گا۔“ اس کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔

”پلیز ہارون۔“ اس کے انداز نے اسے پل بھر میں پھر ملتجی بنا دیا۔ ”تم جانتے ہو میں بچوں سے کتنی محبت کرتی ہوں، میں نے ان دونوں کی طرف کبھی غفلت نہیں برتی، وہ دونوں بہت چھوٹے ہیں، انہیں ماں کی ضرورت ہے۔“

”لیکن ماں کی ضرورت اب کچھ اور ہے۔“

”ہارون، ہم یہ آرام سے بیٹھ کر بھی ڈیسائیڈ کر سکتے ہیں۔“ اس نرمی سے اسے صلح کی طرف مائل کرنا چاہا۔

''رہام ڈیسائیڈ ہوچکا۔'' اس کے لہجے میں چٹانوں سی سختی تھی۔ ''تمہیں طلاق چاہیے، تمہیں مل جائے گی، لیکن حمود اور ہنزہ کو تمہیں بھولنا ہوگا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بے رحمی سے بول رہا تھا اور اس پل رہام نے جانا کہ ہارون نے اس کے لیے یہ سزا تجویز کی ہے۔

''اگر تم کسٹڈی کے لیے کورٹ جانا چاہتی ہو تو شوق سے جاؤ۔ تمہاری سچائی دنیا کے سامنے ظاہر ہونے کے بعد بچے بھی تمہیں اسی طرح یاد رکھیں گے، یہ مت بھولنا۔'' وہ آخری حد تک پہنچ گیا تھا۔

وہ اچھی طرح جانتی تھی اس نے ہارون کو کس قدر تکلیف پہنچائی ہے، اسے اس کے درد کا اندازہ تھا لیکن اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ بچوں کو یوں اس کے خلاف استعمال کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ ان دونوں کے درمیان بھلے جو ہو جائے، وہ بچوں کا مفاد مقدم رکھے گا اور انہیں ماں سے محروم کرنا کہیں سے ان کا مفاد نہیں تھا۔

''ہارون!'' وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ ''میں نے یہ جان بوجھ کر تو نہیں کیا ہے، میرے بس میں......''

''با......س۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''وفا کی ایک ہی وجہ ہوتی ہے محبت اور بے وفائی کے لیے ہزار بہانے ہیں، میرے لئے تمہیں چھوڑنے اور بھولنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ اب محبت نہیں رہی۔'' اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ چند منٹ پہلے تک تو اس طرف محبت تھی۔

''ہارون!'' اس کے رونے میں شدت آگئی۔

''تم کیوں رو رہی ہو؟ خوش ہو جاؤ، مزید چوری کی ضرورت نہیں، تم آزاد ہو۔'' اس نے آستین سے آنکھیں رگڑ کر کہا۔

''آئی ایم رئیلی سوری ہارون...... ہارون...... پلیز......'' ہارون نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کے باہر کیا۔

''اماں اور بچوں سے میں ڈیل کرلوں گا، تمہیں پیپرز مل جائیں گے، اب کبھی ہماری زندگی میں لوٹ کر مت آنا۔'' ہارون نے دروازہ بند کرنا چاہا۔

''ہارون!'' رہام نے دروازہ پکڑ کر روکا۔ ''ہنزہ بہت چھوٹی ہے ہارون، وہ نہیں رہ پائے گی۔'' اس نے منت کی۔

''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، بلکہ وعدہ کرتا ہوں کہ ہم سب تمہارے بغیر بہت اچھے سے رہ لیں گے، تمہیں ہماری فکر کی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ہارون نے زبردستی اسکا ہاتھ ہٹا کر دروازہ بند کیا۔ اماں

اور بچے جاگ نہ جائیں، اس خوف سے اس نے دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔ وہ اپنی اور ہارون کی لڑائی بچوں کے سامنے بالکل نہیں چاہتی تھی۔

ہارون اندر پلنگ پر بیٹھتے ہی اپنا ضبط کھو کر رو دیا۔ دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ بچوں کے کمرے کا دروازہ ان کے کمرے میں بھی کھلتا ہے، جہاں جاگتا حمود سب دیکھ اور سن رہا تھا۔ چھ سالہ حمود نے پہلی بار اپنے ماں باپ کو یوں لڑتے اور روتے دیکھا تھا۔ باپ کو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر وہ بھی پہلی بار تنہا چھپ کر رو دیا تھا۔

ہارون کی مصروفیت اور وقت کی کمی نے اس کا بڑا نقصان کیا تھا۔ وہ یہی سب دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنی مصروفیت سے بچوں کے لیے وقت نکالنے اور انہیں پوری توجہ دینے کا دشوار ترین کام کیا تھا۔ اماں نے بچوں کو سنبھال لیا۔ ان کی مدد کے لیے گھر میں ملازم اور آیا بھی تھے۔ تبھی اسے آسٹریلیا جانے کا موقع ملا اور اسے غنیمت جان کر وہ بچوں کو رہام سے دور لے آیا۔ اماں اور فاطمہ آپا نے بہت کوشش کی کہ وہ دوسری شادی کر لے لیکن اس کے لیے یہی ایک تجربہ عمر بھر کے لئے کافی تھا۔ اماں کے انتقال کے بعد اسے انڈیا آنے کا موقع ملا اور اگر یہاں عبدالحمید سر کی طبیعت اور صوفی کی فوراً شادی کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ ابھی تک وہیں تنہا اور زخم خوردہ زندگی گزار رہا ہوتا۔

ہارون نے اپنی بات ختم کر کے گردن موڑ کر اسے دیکھا، وہ بھری بھری آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پلکیں جھپکائیں تو چند آنسو اس کے گالوں پر لڑھک آئے۔ وہ جو پیروں پر کہنیاں ٹکائیں آگے جھکا تھا، سیدھا ہوا۔

”میں نے یہ بات جان بوجھ کر یا کسی منصوبے کے تحت راز نہیں رکھی تھی، اس دن ”باقی باتوں“ سے میری مراد رہام ہی تھی۔ میرا تم سے اجتناب پہلی ٹھوکر کی وجہ سے تھا، مجھے اس سے محبت تھی اور مکمل اعتماد بھی، میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ میرے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے۔ اس تجربے کے بعد پھر اپنی محبت اور اعتماد کسی اور کو سونپنے کی غلطی میں دہرانا نہیں چاہتا تھا، لیکن میرے ارادے کمزور تھے یا تمہاری موجودگی اتنی زور آور کہ میں پھر یہ غلطی کر بیٹھا۔“ وہ مسکرایا۔ یہ پہلا برملا اقبال تھا۔ صوفی کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔

''اس رات تمہارے کمرے کے باہر اسی کا فون تھا۔ ایک بار محبت کے جواب میں بے وفائی جھیل چکے ہارون اور تمہارے خواہشمند ہارون کے درمیان، ایک بڑی کشمکش اور جنگ کے بعد میں اس دروازے تک آیا تھا اور ٹھیک اسی وقت رہام کی آمد......'' وہ ذرا ٹھہرا۔ ''ایسا نہیں ہے کہ اس فون کے بعد میری خواہش ختم ہوگئی یا میں نے اپنا ارادہ بدل لیا، بس رہام کے فون سے بہت سارے خیال ایک ساتھ ستانے لگے، میں بہت الجھ گیا تھا۔ تم رہام کی موجودگی سے بے خبر تھی اور میں کیسے تمہیں ڈائریکٹ اس کی اس شہر میں موجودگی کی اطلاع دیتا۔ اس کی ضد ہے کہ میں اسے بچوں سے ملنے دوں، وہ ان کے رابطے میں رہنا چاہتی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ سب تمہارے سامنے اس طرح کھلے، میں پہلے رہام سے نپٹنا چاہتا تھا۔''

صوفی کو حمود اور رہام کی ملاقات یاد آگئی۔ وہ فوراً فیصلہ نہیں کر پائی کہ اسے ہارون کو اس بارے میں بتانا چاہیے یا نہیں۔

''حمود تو خیر جانتا ہے لیکن ہنزہ بالکل بے خبر ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اسے اس کی خبر بھی ہو، حمود اور ہنزہ کی زندگی میں رہام کی کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''اس کے لیے شاید دیر ہو چکی۔'' صوفی نے دل میں سوچا۔

''مجھے رہام نے ہی فون کیا تھا کہ اسکول کے باہر تم دونوں کی ملاقات ہوئی ہے، میں اتنا سنتے ہی فوراً دوڑا آیا ہوں، میں نے کیوں اور کیسے بھی نہیں پوچھا، اب تم ہی بتا دو کہاں، کیوں اور کیسے؟'' اسی وقت ہارون کا فون بج اٹھا۔ اس نے فون اٹھا کر دوسری طرف کی بات سنی اور پھر خود کے جلد ہی سینٹر پہنچنے کا یقین دلاتے ہوئے فون رکھ دیا۔

''آپ جائیں۔'' ہارون کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے کہا۔

''تمہیں کچھ کہنا یا پوچھنا ہے تو......''

''ہم شام میں بات کرتے ہیں۔'' اسے پوچھنا تو بہت کچھ تھا لیکن اس سے پہلے بہت کچھ سوچنا بھی تھا۔

''آپ کا صبح والا آفر اب بھی موجود تو ہے ناں؟'' ہارون اس کی بات پر دھیرے سے ہنسا۔

''میں جلد آنے کی کوشش کروں گا، نکلنے سے پہلے کال کرتا ہوں تم ریڈی رہنا۔ آئی ہوپ تمہارا غصہ اور غلط فہمی دونوں دور ہوگئی ہے۔''

"غصہ اب بھی ہے۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"وہ کیوں؟" اس نے بھی تقلید کی اور صوفے سے اٹھا۔

"آپ رہام کے فون والی بات مجھے اسی وقت بتا سکتے تھے اور اگر رہام کا ذکر نہیں کرنا تھا تب بھی چپ رہ کے مجھے سزا دینا کہیں سے درست نہیں تھا۔"

"ہمم...... گلٹی ایز چارجڈ۔" اس نے فوراً مان لیا۔ اس کے فون پر ٹیکسٹ موصول ہوا۔ اس کے ماتحت کا پیغام تھا۔

"مجھے ابھی جانا ہو گا۔"

"ہمم، جائیں۔" اس نے گویا اجازت دی۔

پھر وہ چلا گیا۔

ہارون کی کہی باتیں دل میں دہراتے ہوئے رہام پر اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کیسے کوئی عورت اپنی خواہش کی خاطر معصوم بچوں کو چھوڑ سکتی ہے؟ نفس کی ایسی غلامی پر وہ تلملا رہی تھی۔ پھر ہارون کی تکلیف اور درد کا احساس بار بار پلکیں بھگو رہا تھا۔

"وہ ماں اور عورت کہلانے لائق نہیں ہے، اسے صرف خود غرض کہا جا سکتا ہے۔ اس کا حمود اور ہمنر سے دور رہنا ہی درست تھا اور ہے۔"

شام میں ہارون کے فون کے بعد وہ تیار ہو کر اس کی منتظر تھی لیکن ہارون سے پہلے ہی فاطمہ آپا آ گئیں۔ اس نے فون کر کے ہارون کو آگاہ کر دیا۔ ہارون کے آتے ہی وہ دونوں اس کے کمرے میں بند ہو گئے تھے۔ بڑی دیر بعد وہ آداب میزبانی نبھانے کے لئے کافی لے کر ہارون کے کمرے تک آئی اور فاطمہ آپا کی باتیں سن کر باہر ہی رک گئی۔

"یہ تو ظلم ہے نا ہارون بچوں اور ماں دونوں پر، اسے اپنی غلطی کا احساس ہے، وہ شرمندہ ہے، تڑپ رہی ہے بچوں کی شکل دیکھنے کے لیے، ماں کے ہوتے ہوئے بچے کیوں ماں سے محروم رہیں؟ یہ سراسر زیادتی ہے۔ ماں کو بچوں سے دور کر اور بچوں کو ماں کی محبت سے محروم رکھ کر تم گناہ کے مرتکب ہو رہے ہو، تم یہ حقیقت تو نہیں بدل

سکتے کہ اس نے انہیں جنم دیا ہے اور سب سے زیادہ حق تو پیدا کرنے والے کا ہی ہوتا ہے، پھر سب سے اچھا انتقام اور بدلہ تو معافی ہے، تم بھی در گزر کی راہ لو، معاف کر دو اسے۔ تم پڑھے لکھے، کھلے ذہن کے مالک ہو، سالوں باہر رہ چکے ہو، مجھ سے زیادہ اچھے سے جانتے ہو یہ سب......" وہ رِہام کی وکیل بن کر آئی تھیں۔ کل تک ان کے لیے بری عورت رہی رِہام آج صوفی کے متبادل کے طور پر ان کے لئے صبح کا بھولا ہو گئی تھی۔ صوفی کے لیے ان کی ناپسندیدگی نے بڑی آسانی سے بری عورت کی تعریف بدل دی تھی۔ ہارون بھی ان کے رِہام کی حمایت کرنے پر متعجب تھا۔

"تم نے اس سے محبت کی شادی کی تھی جب کہ تمہاری یہ شادی ایک مرتے کے اطمینان کے لیے تھی، میں نے پہلے بھی کہا تھا تمہیں اس کا کوئی اور انتظام کر دو۔ ہو سکتا ہے، قدرت نے تمہیں ایک موقع دیا ہے۔"

"آپا!" ہارون نے قطع کلامی کی۔ تبھی صوفی ٹرے لیے اندر داخل ہوئی۔ فاطمہ آپا نے پہلو بدلا اور اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ہارون کو افسوس ہوا کہ ایک بار پھر وہ فاطمہ آپا کی دل آزار باتیں سن چکی ہے۔

وہ ٹرے رکھ کر ان دونوں کی سمت نگاہ کیے بغیر ہی باہر نکل گئی۔

بڑی دیر تک وہ دونوں کمرے سے باہر نہیں نکلیں یہاں تک کہ حمود، منز اور اس کا کھانا بھی ہو گیا۔ کھانے کے دوران حمود کو خاموش دیکھ کر اسے خیال آیا کہ رِہام کے متعلق اس سے بات کرنا چاہیے لیکن پھر وہ یہ سوچ کر رک گئی کہ رِہام اور حمود کی ملاقات کے متعلق پہلے ہارون سے بات کرنا ضروری ہے اور زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ہارون خود ہی حمود سے بات کرے۔ منز کے سونے کے بعد وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ اسی وقت ہارون فاطمہ آپا کو گیٹ تک چھوڑ کر واپس آ رہا تھا۔

"کھانا؟" صوفی نے پوچھا۔

"نہیں، بھوک نہیں ہے۔" وہ اس کے قریب آیا۔ "تم ہمیشہ غلط وقت پر ہی دروازے اور کھڑکیوں کے پاس کیوں پہنچتی ہو؟"

"تا کہ اپنے متعلق سچ سن سکوں۔"

"سچ؟ تم ہمیشہ ایک فریق کی بات سن کر بھاگ نکلتی ہو، دوسرے کا سچ کہاں سنا کبھی۔"

صوفی نے سر اٹھا کر ہارون کو دیکھا۔ "ابھی سنا دیں۔"

اس فرمائش پر وہ مسکرا کر مزید قریب ہوا تبھی فون میں ریمائنڈر کی مخصوص رنگ شروع ہوگئی۔ ہارون نے فون پر ایک نظر ڈال کر رنگ بند کی۔

ہجر کو حوصلہ اور وصل کو فرصت درکار
اِک محبت کے لیے ایک جوانی کم ہے

اس نے شعر پڑھا۔

"اس سائنس داں بندے کی زباں سے شعر!" صوفی کو خوشی آمیز حیرت نے گھیرا۔ ہارون نے آہ بھر کر صوفی کی پیشانی پر اپنی پیشانی ٹکائی۔

"مجھے کچھ ضروری میل کرنی ہیں، اسی وقت۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

صوفی کو ہنسی آگئی۔

صبح وہ پھر ناشتے کے ٹیبل پر غیر حاضر تھا۔ حمود اور ہنزر کے سکول جانے کے بعد ذرا فرصت ملتے ہی اس نے اپنا فون اٹھایا تو وہاں ہارون کا پیغام تھا۔

"شام میں رہام سے مل کر یہ قصہ ختم کرنا ہے اسی لئے سینٹر جلد جا رہا ہوں۔ مطمئن رہو، تمہارے گھر اور اس کے سکون کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

اس نے یہ مختصر ٹیکسٹ بار بار پڑھا اور پھر واقعی مطمئن ہو کر معمول کے کاموں میں لگ گئی۔ اس نے دوپہر کا کھانا بنایا تب تک ملازمہ آگئی۔ اپنی نگرانی میں گھر کی صفائی اور دیگر کام کروا کر اس نے ملازمہ کو رخصت کیا۔ پھر ڈرائیور کے ساتھ جا کر ہنزر کو اسکول سے لے کر گھر آئی۔ ہنزر کھانا کھا کر سوئی تو حافظ صاحب کے آنے سے پہلے اسے اٹھانا پڑا۔ اس دوران حمود بھی سکول سے آکر کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔ عربی کے بعد وہ دونوں اپنی کلاس کو چلے گئے۔ کچھ دیر سونے کے ارادے سے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ حمود کے کمرے کے سامنے ذرا ٹھہری پھر دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ حمود کا کمرہ دیگر کمروں کی بہ نسبت چھوٹا تھا۔ اس کے پاس بھی باپ کی

طرح کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ فرق اتنا تھا کہ یہاں تمام کتابیں سلیقے سے جمی تھیں۔

وہ آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

”رہام نے فون کر کے فوراً میرے متعلق خبر دی، تو کیا اپنی اور حمود کی ملاقات کا بھی بتا دیا ہوگا؟ اگر ایسا ہوتا تو مجھے ضرور بتایا ہوتا۔ جب خود کو اچھا ظاہر کرنا ہی تھا تو چوری چھپے ملنے کی ضرورت کیا تھی؟ یا میری ملاقات کا فون صرف اپنے پوائنٹس بڑھانے کے چکر میں کیا تھا اور دوسری طرف چپکے چپکے بیٹے کا برین واش کر رہی ہے۔ کیا حمود اس معاملے میں اپنی ماں کا ساتھ دے گا؟ اگر حمود رہام کے ساتھ جانے اور رہنے کو تیار ہو گیا تو؟ وہ واپس یوایس جانے کی بات بھی تو کر رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے قریب رہنا چاہتا ہے، اسی لیے اس نے ہُنر کی طرح مجھے مما بھی نہیں کہا، وہ لاکھ سمجھدار سہی ہے تو بچہ ہی، اسے ابھی صحیح غلط کی تمیز کہاں ہے۔“ وہ ٹیبل پر رکھیں چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔

”بڑی سطحی عورت ہے رہام جو اپنے مفاد کے لیے بچے کو استعمال کر رہی ہے۔ اور اتنے سالوں تک تھی کہاں؟ اچانک اب کیسے محبت جاگ اٹھی؟ لگتا ہے دوسری محبت سے بھی دل بھر گیا ہے۔“

ٹیبل سے بلیو ڈائری اٹھا کر کھولتے ہی خیالات کے تسلسل میں خلل پڑ گیا۔ وہ ڈائری انڈیا آنے کے بعد لکھی گئی تھی۔ آخری تحریر کل رات کی تھی۔ اس میں سکول، نصاب یا علم کی باتیں نہ تھیں۔ ان صفحات پر حمود کے دل کی باتیں درج تھیں۔ وہ پڑھتی گئی اور روتی رہی۔

ہارون اور رہام کے معاملے کا سب سے اہم فریق حمود تھا۔ میاں بیوی کے مسائل میں ہمیشہ بچوں کو نا سمجھ اور چھوٹے جان کر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ کم عمر اور نادان ہونے کا یہ مطلب سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ کچھ محسوس نہیں کرتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بچے پر عمر اور سمجھ سے بالاتر، اس کے آس پاس رونما ہونے والا ہر حادثہ، چاہے معمولی ہو یا بہت بڑا، اثر انداز ضرور ہوتا ہے۔ کسی پر سرسری تو کسی پر بہت گہرا۔ حمود نے بھی کم عمری کے باوجود اپنے والدین کی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیاں محسوس کی تھیں۔ اس نے گھر میں اداس، خاموش اور اکتائی ماں کو شاپنگ کے دوران ملے انکل سے بار بار کی ملاقاتوں میں خوش، متبسم اور باتیں کرتے دیکھا تھا۔ اسے ماں کا یہ روپ زیادہ پسند آیا تھا۔ وہ ماں کو ہمیشہ ایسے ہی خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر اس نے اپنے مصروف باپ کو ماں

کے ساتھ الجھتے دیکھا۔ اس کے ننھے سے ذہن ودل کے لیے سب سے بڑا صدمہ کمرے میں تنہا بیٹھے باپ کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھنا تھا۔ اسے گھر کی چار دیواری کے باہر انکل کی صحبت میں کھل کر ہنستی مسکراتی ماں کو دیکھ کر جتنی خوشی ہوتی تھی، باپ کو یوں روتے دیکھ کر اس سے کئی زیادہ دکھ ہوا تھا۔ اسے وفا، دغا، گناہ، جزا کا علم نہیں تھا لیکن اسے ماں باپ کی خوشی اور اداسی محسوس ہوتی تھی۔ ماں باپ کے قصور اور غلطیوں سے ماورا اسے دونوں سے یکساں محبت تھی اور کچی عمر میں ہی اپنی محبوب ہستیوں کو ایک دوسرے سے لڑتے اور روتے دیکھنے کا دکھ اس معصوم نے تنہا سہا تھا۔ اس نے باپ سے دور ماں کو خوش اور ماں کے جانے کے بعد ہارون کو اداس دیکھا تھا۔ رِہام کے ساتھ رہنے کی خواہش کے باوجود اس نے اپنی عقل اور سمجھ سے باپ کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اسے لگا تھا کہ ہنزر اور حمود کے بغیر ہارون مزید اداس اور دکھی ہوگا اور وہ دونوں کو خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ کچھ دنوں بعد کسٹڈی کے لیے کورٹ جانے سے پہلے رِہام اسکول میں حمود سے ملنے آئی تو اس کی اس بات پر دنگ رہ گئی۔ اس وقت بڑا بن کر حمود نے ماں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ فکر مند نہ ہو، وہ اپنا، ہنزر کا اور پاپا کا بہت اچھے سے خیال رکھے گا، وہ انہیں اپنے ساتھ لے جانے کی ضد نہ کریں۔

رِہام کے دوسری شادی کر لینے کے بعد بھی ان دونوں میں فون کے ذریعے رابطہ تھا۔ لیکن ایک دن دادی کو خبر ہوگئی اور انہوں نے اسے سمجھانے کے ساتھ ساتھ رہام سے جانے کیا بات کی کہ رہام نے آخری بار فون پر ڈھیروں باتیں کرنے کے بعد اسے سمجھایا کہ اب وہ ایک دوسرے کو فون نہیں کریں گے۔

ہارون کی صوفی سے شادی کے بعد اسے یہ خدشہ تھا کہ پھر وہی کہانی نہ دہرائی جائے لیکن جلد ہی اس نے اپنے باپ میں تبدیلیاں نوٹ کی تھیں۔ ہارون کے ساتھ ساتھ وہ بھی صوفی کو قبول کر کے خوش تھا۔ اور اب رِہام کی آمد نے اسے اسی دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس کی آخری تحریر ماں سے محبت، اس سے دوری کے دکھ اور اس کے ساتھ رہنے کی حسرت سے بھری تھی، اس کے باوجود اس سمجھدار بچے نے اپنی خواہش رد کر کے اپنے باپ کی خوشی کو چنا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی ماں کو مایوس کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ان صفحات پر ماں سے دوری کا کرب، اس کی یاد میں نکلے آنسو اور باپ کی تنہائی کا افسوس بکھرا تھا اور یہ سب اس گیارہ سالہ بچے نے لکھا تھا جس کے بے فکری اور موج مستی کے دن تھے۔ جس عمر میں اسے ہم عمروں

کے ساتھ کھیل کود میں مگن ہونا چاہیے تھا اس عمر میں وہ بڑوں کے نصیب کے کھیل کی گتھیوں میں الجھا تھا۔اس نے ڈائری میں صوفی اور ہارون کی محبت کو بھی لکھا تھا۔اسے سب کے دل کی خبر تھی لیکن اس کے دل کی کسی کو خبر نہیں تھی۔

صوفی ڈائری سینے سے لگائے رو رہی تھی۔

والدین سے محبت کی قیمت ادا کرنے کے لیے وہ گیارہ سالہ بچہ اپنی خواہشات داؤ پر لگا رہا تھا اور کسی کو خبر بھی نہ تھی۔دنیا کے لئے یہ بہت پیچیدہ مسئلہ ہو لیکن حمود کی ڈائری میں اس کی سوچ بہت واضح تھی۔اس کے لئے والدین کے ہنستے مسکراتے چہرے اور ان کی خوشی مقدم تھی۔اس کیلئے رہام بہت اچھی ماں اور ہارون بہت اچھا باپ تھا۔وہ ایک دوسرے کے لئے کیسے میاں بیوی ثابت ہوئے تھے اس سے ان کے اچھے والدین ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔اس بچے کی سوچ دنیاداری سے آلودہ نہیں ہوئی تھی۔اسے اپنی سوچ پر شرمندگی ہو رہی تھی کیونکہ کچھ دیر پہلے ہی اس کے اندر یہ ناز ابھرا تھا کہ رہام سے اچھی ماں تو وہ ثابت ہوئی ہے، جسے چند مہینوں میں ہی حمود اور ہنزہ سے اس قدر محبت ہوگئی ہے اور اگلے ہی پل اس نے رہام کو بری اور بدکردار عورت مان لیا تھا، جو پیدا کرنے کے باوجود بھی ان بچوں سے اس طرح محبت نہ کر سکی اور چھوڑ کر چلی گئی۔ان کی پرواہ نہ کی۔

اس نے سنبھل کر اپنے آنسو صاف کیے۔اب اسے ہارون اور رہام، دونوں پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ان کا بچوں سے محبت کا دعویٰ نرا زبانی جمع خرچ تھا۔بظاہر بچوں کے لیے لڑ رہے تھے مگر حقیقتاً اولاد کو مکمل نظرانداز کیا ہوا تھا۔وہ کچھ فیصلہ کر کے حمود کی ڈائری لیے ہارون کے کمرے میں آئی۔میز پر رکھی چھوٹی سی کین کی ٹوکری میں رکھے بک مارکس میں سے سرخ اینگری برڈ اٹھا کر ڈائری میں لگایا تاکہ ہارون کی توجہ اس طرف جائے اور ڈائری میز پر رکھ دی۔

اس نے ایک تفصیلی نظر کمرے پر ڈالی۔ہمیشہ کی طرح سفید اور سرمئی کمرے میں کتابوں کی الماری اچھی نہیں لگ رہی تھی۔اس کے ذہن میں خیال آیا کہ سفید رنگ کی طرح شفاف اور معصوم بچے اور سفید و سیاہ کے امتزاج والے گرے ماں باپ کے درمیان اس کا وجود بھی آنکھوں میں چبھنے والی الماری کی طرح ہے، جسے ہٹاتے ہی کمرہ مکمل اور بھلا معلوم ہوگا۔

وہ آنکھیں پونچھتی پلٹی ہی تھی کہ ہارون دروازہ کھول کر اندر آیا۔

''اوہو، آج تم۔'' اس کی بھیگیں پلکیں، نم آنکھیں اور سرخ چہرہ دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔

''میرا صبح کا ٹیکسٹ نہیں دیکھا تم نے؟'' اسے لگا اس کے پھر بنا اطلاع دیے اور بنا ملے جانے پر وہ پریشان ہے۔

''آپ کیوں چاہتے ہیں کہ حمود اور ہنزہ، رہام سے نہ ملیں؟''

''آں۔'' ہارون کے لیے صوفی کا حلیہ کم پریشان کن نہ تھا کہ اس پر بنا دعا سلام اور تمہید کے یہ اچانک اور عجیب سوال۔

''آپ رہام کو بچوں سے کیوں دور رکھنا چاہتے ہیں؟'' وہ جانتی تھی، وہ سن چکا ہے پھر بھی دہرایا۔

''کیا اس سوال کی ضرورت ہے؟''

''ہاں، مجھے آپ کی وجہ جاننا ہے۔''

''اس نے افیئر کے بعد مجھ سے طلاق لے لی اور تمہیں وجہ جاننا ہے کہ میں اسے اپنے بچوں سے دور کیوں رکھنا چاہتا ہوں؟''

''افیئر اور طلاق کے مطالبے پر ثابت ہوا کہ وہ وفادار اور اچھی بیوی نہ تھی لیکن......''

''کیا اچھی ماں کے لیے اچھی بیوی ہونا ضروری نہیں؟''

''لازمی نہیں۔'' حمود نے اس کی سوچ کو نیا زاویہ عطا کیا تھا۔

ہارون نے الجھ کر صوفی کو دیکھا۔

''تو تم کہنا چاہ رہی ہو کہ میرا بچوں کو رہام سے دور رکھنا غلط ہے؟'' ہارون کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''آپ کے نزدیک یہ صحیح کیوں ہے؟''

''صوفی!'' وہ آگے بڑھ کر اس کے مقابل آیا۔ ''میں تمہیں ساری داستان سنا چکا ہوں، اس کے بعد تمہارا یہ سوال میری سمجھ سے باہر ہے۔'' اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ ''جو بھی ہے، کھل کر کہو تا کہ میں بھی کچھ سمجھ سکوں۔''

''بحیثیت میاں بیوی آپ دونوں میں کون صحیح تھا اور کون غلط تھا، یہ فیصلہ کرتے وقت میرا جانبدار ہونا فطری

ہے شاید، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ رشتہ ٹوٹنے اور ختم ہونے کے ذمہ دار دونوں فریق ہوتے ہیں، کوئی کم تو کوئی زیادہ۔ اس وقت آپ کا ہرٹ ہونا، غصہ ہونا سب جائز تھا کہ آپ کے ساتھ غلط ہوا تھا، زیادتی ہوئی تھی، مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ اس کے بعد سارے فیصلے آپ نے بطور شوہر کیے، بحیثیت باپ نہیں۔"

"اور تمہارے خیال میں بحیثیت باپ میرا فیصلہ مختلف ہوتا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور کیا ہوتا وہ فیصلہ؟" اس کی آواز میں اب غصہ کا عنصر چھلک رہا تھا۔

"آپ کو کبھی رہام سے محبت کا دعویٰ تھا سو آپ ہی بہتر بتا سکتے ہیں کہ وہ بدکردار اور بری عورت تھی یا اس کا افیئر انسانی غلطی تھی، ایک بشری لغزش اور اگر وہ صرف بے وفائی تھی، بدکرداری نہیں تو آپ کو کوئی حق نہ تھا کہ آپ ایک محبت کرنے والی ماں کو بچوں سے دور کرتے۔"

اس لمحہ وہ صرف عورت اور ایک دوسری عورت کی وکیل تھی۔

"شادی میں دونوں فریق خوش نہیں ہیں، میاں بیوی کے بیچ مسائل ہیں تو دین نے انہیں الگ ہونے کا حق دیا ہے، دنیاوی قانون بھی موجود ہے، اس کے باوجود ہمارے معاشرے میں عام رائے یہی ہے کہ طلاق لے کر، بچے چھوڑ کر دوسری شادی کرنے والی عورت بری ہوتی ہے حالانکہ یہ کلیہ ہر عورت پر صادق نہیں آتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے بھی ایسا ہی سوچا۔ اس وقت آپ غصہ تھے، زخم خوردہ تھے، دکھی تھے، اس لیے رہام کو اپنی اور بچوں کی زندگی سے دور رکھنے کا جواز سمجھ میں آتا ہے لیکن اس تکلیف سے سنبھلنے کے بعد تو آپ کو کھلے دل و دماغ سے حمود اور ہنزہ کی بہتری کا سوچنا چاہیے تھا۔ اگر بچوں کو چھوڑنے پر وہ بری ماں ہے تو انہیں ماں سے دور رکھ کے آپ بھی اچھے باپ ثابت نہیں ہوئے۔ اس طرح تو آپ نے رہام سے انتقام لیا پھر خود ہی ظلم پلے کرتے رہے۔" اس قدر سفاکی سے سچ کہنے کا اس کا پہلا موقع تھا اور ہارون کا سننے کا۔ وہ بے آرام ہوا تھا، اس کا ہر لفظ اسے کوڑے کی طرح لگا تھا، اس پر غصہ اور جھنجلاہٹ ایک ساتھ سوار ہوئے۔

"آپ دونوں اچھے میاں بیوی تو نہ تھے لیکن بچوں سے محبت کے باوجود بھی اپنی خود غرضی اور انا کے ہاتھوں اچھے والدین نہ بن سکے۔ رہام کو اتنے سالوں بعد اب تڑپ دکھانے کی بجائے اسی وقت معاملہ سرد ہونے پر

آپ کو منانے اور سمجھانے کی کوشش کرنا چاہیے تھی، آپ پر بھی اس سے انتقام اور بدلے کی جگہ حمود اور ہنزر کی ضروریات اور مفادات کو اولیت دینا فرض تھا۔ ماموں جان اور ممانی جان کی محبت کے سائے میں رہنے کے بعد بھی ماں کی محبت سے محرومی کبھی کبھی مجھے کم نصیبی کا احساس دلاتی ہے، حمود اور ہنزر کم نصیب نہیں ہیں لیکن آپ انہیں محروم رکھنے کے مجرم ہیں۔"

صوفی نے آئینے سے گرد صاف نہیں کی تھی بلکہ ایک نیا شفاف آئینہ اس کے سامنے رکھا تھا اور اتنا تو وہ خود بھی جانتا تھا کہ بہت کچھ وہ جان بوجھ کر نظر انداز کرتا رہا ہے۔ صوفی کی باتیں سچ سہی لیکن اپنی دانست میں وہ اب بھی حق بجانب تھا۔ اس کا درد اور اس پر بیتی کو سمجھنا کسی اور کے بس کا نہ تھا۔ اسکے ماتھے اور گردن کی تنی رگیں اس کے اندر اٹھ رہے ابال کی مظہر تھیں۔

"وہاں آپ کے لیے کچھ رکھا ہے۔" صوفی نے میز پر حمود کی ڈائری کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے بعد آپ کے لیے فیصلہ کرنا آسان ہوگا۔" اس نے آخری بار استحقاق بھری نظر ہارون کے چہرے پر ڈالی اور دروازے کی سمت بڑھی۔

"صوفی، صوفی!" وہ اس کے پیچھے لپکا ہی تھا کہ چونک کر پلٹا۔ میز پر دھری چیزوں میں اضافہ وہ بلیو ڈائیری تھی۔ وہ میز تک آیا اور ڈائری اٹھا کر کھولی۔

"صوفی!"

پیچھے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے حمود کی آواز پر اس کے قدم تھم گئے۔ وہ آہستہ سے پلٹی۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ جانے کب سے وہاں کھڑا وہ سب سن رہا تھا۔ اس معصوم کا حال دل اس پر کھل چکا تھا اور اس تنہا اور ننھے بچے کا درد اس کا دل کچل رہا تھا۔ بڑے ظالم ہوتے ہیں بڑے، اور بڑوں میں وہ بھی شامل تھی۔ حمود کے قریب آ کر اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"آپ بہت بہادر اور اچھے بچے ہو۔" اس نے بمشکل آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"مجھے آپ پر بہت فخر ہے۔" اس نے حمود کا چہرہ ہاتھوں میں لیا۔ اس کی آنکھیں بھری تھیں۔

"تھینک یو۔" وہ آنسوؤں کے درمیان مسکرایا۔ "آپ واقعی بہت اچھی دوست ہیں۔" اس نے بھی

انگریزی میں کہا۔

صوفی نے بے اختیار اسے خود سے لپٹا لیا۔ وہ دونوں رو رہے تھے۔

''مما۔ بھائی۔'' ہنزہ کی حیرانی بھری پکار پر وہ دونوں چونک کر الگ ہوئے۔ ڈرائنگ روم کے دروازے میں کھڑی ہنزہ دونوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''آپ کب آئے بیٹا؟'' چہرہ صاف کرتے ہوئے آگے بڑھ کر اس نے ہنزہ کو گود میں اٹھایا۔ وہ معصوم بالکل بے خبر تھی۔

''بھائی کے ساتھ ہی آئی ہوں۔''

''آپ کو بھوک لگی ہو گی، چلو کچھ بناتے ہیں۔'' وہ اسے لے کر کچن میں چلی گئی اور حمود اپنے کمرے میں۔ اندر پھیلی آہ و فغاں اور ہنزہ کے سوالوں سے بچنے کے لئے وہ مسلسل بولے جا رہی تھی۔ پھر بھی ہنزہ کے سوال سے بچ نہیں پائی۔ اپنے رونے کی وجہ کے لیے ایک بار پھر اس نے ماموں جان کی یاد کا سہارا لیا۔

رات میں کھانے کی میز پر ایک بار پھر وہ تینوں ہی تھے۔ ہارون غیر حاضر تھا۔

اگلے دن فجر کے بعد اس نے اپنا بیگ تیار کیا، سوئی ہنزہ کو پیار کیا اور ہارون کے دروازے پر الوداعی نظر ڈال کر اندھیرے میں ہی چپکے سے گیٹ کے باہر نکل گئی۔

***

کیب سے گھر پہنچ کر اس نے قفل کھولا اور صحن میں داخل ہوئی۔

''لوٹ آئی میں اپنے گھر ماموں جان۔'' اس نے با آواز بلند ماموں جان کو مخاطب کیا۔

سارا راستہ تنبیہ کے باوجود پھسل پھسل کر رخسار پر آ رہے آنسو پونچھتی آئی تھی اور اب سہولت سے انہیں رخسار سے پھسل کر گریبان میں جذب ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ اس خالی گھر میں پہلے بھی آئی تھی اور روتی رہی تھی لیکن تب اسے کام نپٹا کر واپس جانا ہے۔ اس بار ایسی کوئی بندش تھی نہ واپسی کی گنجائش۔

وہ بیگ گھسیٹتے ہوئے ہال میں آئی اور ماموں جان کے دیوان سے چادر ہٹا کر وہاں لیٹ گئی۔ اب آنسو تکیے میں گم ہو رہے تھے۔ صفوان گھر کی صفائی کرواتا رہا تھا اس لیے گرد و غبار نہ تھا۔ کتنی دیر یوں روتے ہوئے گزری

پھر پیٹ نے دہائیاں شروع کر دی کہ کب تک صرف دل کے تقاضے پورے کرو گی ادھر بھی توجہ دو۔ وہ نظر انداز کرتے ہوئے لیٹی رہی۔ اب اس کا دھیان بھٹک کر اس گھر کی طرف جا رہا تھا جو وہ چھوڑ آئی تھی۔

"سب بیدار ہو گئے ہوں گے، آج چھٹی ہے پھر بھی سبھی آٹھ بجے تک جاگنے کے عادی ہیں، ہنزہ اسے ڈھونڈ رہی ہوگی، حمود شاید سمجھ گیا ہوگا کہ وہ چلی گئی ہے اور......اور وہ......" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ صفوان کو فون کیا کہ وہ گھر آئی ہے اور وہ اس کے لیے ناشتہ بنانے کے لوازمات لے آئے۔

اس نے رات میں بھی کھانا نہیں کھایا تھا اس لیے اب بھوک شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ آخر وہ اٹھ کر کچن میں آئی اور ڈبے کھول کر کچھ کھانے کے لیے تلاش کرنے لگی۔ چار پانچ ڈبوں کی ناکامی کے بعد ایک ڈبے میں بسکٹ کا پیکٹ مل گیا۔ اس نے ایکسپائری ڈیٹ دیکھے بغیر ہی گلاس میں پانی لیا اور بسکٹ کا پیکٹ کر ہال میں آئی۔

تبھی خارجی دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ گلاس اور پلیٹ تپائی پر رکھ کر دروازہ کھولنے صحن میں آئی۔

"اتنی دیر لگا دی تم نے صف......" دروازہ پورا کھلتے ہی اس کا منہ بند ہو گیا۔

"ٹریفک، چیمبور سے یہاں تک کا فاصلہ اور روڈز کی کنڈیشن کے لحاظ سے تو میں ٹھیک ٹھاک وقت پر پہنچا ہوں۔" ہارون نے پہلے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی پھر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اسکی زبان کو بریک لگا تھا مگر دل کا ایکسیلیٹر فل تھا۔

"تم میں تبدیلیاں تو بہت آئی ہیں، مگر گھر آئے مہمان سے تمہارا برتاؤ اب بھی پہلے دن اتنا ہی برا ہے۔"

صوفی نے دروازے کے دونوں پٹ سے ہاتھ ہٹائے اور اندر چلی آئی۔ ہارون نے تقلید کی۔ ہارون نے میز پر رکھے گلاس اور بسکٹ کو دیکھا پھر دیوان کے قریب رکھے اس کے بیگ کو۔

"کیوں آئے ہیں آپ یہاں؟" وہ اس سے دور جا کر کھڑی تھی۔ ہارون کو دیکھتے ہی اپنے خسارے کا احساس اسے پھر جذباتی کر رہا تھا اور وہ رو کر اسے یہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ یہ فیصلہ اس کے لیے کس قدر مشکل ہے۔

"تمہارے سوال کا جواب دینے۔" وہ قریب آیا۔

"اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"وہ کیوں؟"

صوفی خاموش رہی۔ منہ کھولتے ہی آنکھوں کے بند ٹوٹنے کا خطرہ جو تھا۔ ہارون کچھ پل ضبط کی کوشش میں سرخ ہوتی ناک اور بار بار جھپکتی پلکیں دیکھتا رہا۔

''تم بڑی بے رحمی اور سفاکی سے آئینہ دکھاتی ہو۔'' اس کی سرگوشی نما بات پر صوفی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''ایک اور خاص خوبی ہے تمہاری۔'' اب اس کا انداز بدلا تھا۔ ''تمہارا سچ کہنے کا انداز ایسا ہے کہ اچھا خاصا صابر بندہ بھی طیش میں آجائے۔'' صوفی جو کسی نفیس و نرم بات کی امید کر رہی تھی، اسے گھورنے لگی۔ وہ ہلکے سے مسکرایا پھر سنجیدہ ہوا۔

''تھینک یو، اس سفاکی اور بے رحمی کے لیے۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے اور حمود کو جاننے اور اس سے محبت کا دعویٰ کرنے کے بعد کل اس کی ڈائری پڑھ کر میں نے جانا کہ کس قدر ناکام انسان ہوں میں۔ میں نے ہمیشہ اس کی غیر معمولی ذہانت اور سمجھداری پر فخر کیا لیکن کبھی غور نہیں کیا کہ قدرت کے اس تحفے کی وجہ سے اس کے قریب رونما ہو رہے واقعات اور حالات کا اثر بھی اس پر غیر معمولی ہوتا رہا ہے، آسائش، تربیت، تحفظ اور ماحول کے ساتھ ساتھ میں اسے وہ اعتماد اور ساتھ دینا بھول گیا جو اسے ڈائری کی بجائے میرے سامنے اپنا دل کھولنے پر مجبور کرتا، سچ کہوں تو کل سے پہلے میرا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا کہ حمود کا کوئی قریبی دوست نہیں ہے۔'' وہ طنزیہ ہنسا۔ ''اس کی تنہائی محسوس کرنا تو دور کی بات۔'' وہ اپنی کمیاں، کوتاہیاں اور غلطیاں مانتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ وہ ٹھہر کر ذرا سنبھلا پھر گویا ہوا۔

''ایک دن اور ایک دفعہ کی بات میں تبدیلی نہیں آئے گی، پھر بھی یہاں آنے سے پہلے میں باپ بیٹے کے درمیان پل کی بنیاد رکھ آیا ہوں۔'' صوفی کو یک گونہ سکون محسوس ہوا تھا۔

''رہام کے متعلق تم نے ٹھیک کہا تھا، اس کی زیادتی اور غلطی کے جواب میں، میں نے بھی غلطی اور زیادتی کی۔ میں ماں کے ہوتے ہوئے بچوں کو اسکی محبت اور قربت سے محروم رکھنے کا قصوروار ہوں، میں اس سب کو درست کرنے تیار ہوں۔''

صوفی کو غصہ آیا کتنے آرام سے وہ اس کے مقابل اعتراف کر رہا تھا، رتی برابر اس کی پروا نہ تھی۔ سطح چشم پہ نمی کا توازن پھر بگڑا اور وہ پلکیں جھپک کر خود کو عیاں ہونے سے روکنے لگی۔

ہارون درمیان کا قدم بھر کا فاصلہ مٹا کر بالکل اسکے پاس آیا۔

''اب تم بتاؤ، بنا کچھ کہے، چوری چھپے یہاں کیوں چلی آئی؟''

ذرا دیر پہلے، اعترافِ تقصیرات کا دشوار مرحلہ طے کرنے سے پہلے اگر وہ یہ سوال کرتا تو وہ بڑا دھواں دھار جواب دیتی لیکن اب......

''ہمم؟'' اس کے سوالیہ ہنکار پر اس نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ابھی ابھی آپ نے تسلیم کیا ہے کہ رہام اور بچوں کو ایک دوسرے سے دور نہیں رہنا چاہیے۔''

ہارون اس کے مزید کچھ کہنے کے انتظار میں رکا رہا لیکن وہ چپ رہی تو اس نے استفسار کیا۔

''تو......؟''

''تو میرا وہاں کیا کام؟''

اس کی مختصر بات کا مطلب سمجھنے کے لیے ہارون کو ذرا وقت لگا تھا۔

''واہ!'' اس نے جلد ہی اپنی حیرت پر قابو پایا۔

''کل مجھے طعنہ دیا جا رہا تھا کہ میں نے رائے عامہ کو اپنا خیال بنا لیا اور یہ کیا ہے؟''

صوفی خاموش رہی۔

''رہام اور بچوں کے ملنے سے تمہاری موجودگی کس طرح متاثر ہوگی ذرا سمجھانا مجھے۔''

اس کی ہمت جواب دے گئی اور صبر ٹوٹ گیا۔

''صوفی!'' ہارون نے اسکے گال پر لڑھک رہے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے روکا۔

''یہ بھی غلط رائے عامہ ہے کہ رہام اور بچوں کے ملنے کی ایک ہی شرط ہے کہ ہم ساتھ رہیں اور اس سے بری بات یہ کہ تم نے سوچ لیا کہ رہام واقعی بری عورت ہے جو دوسرا شوہر چھوڑا اپنے ایکس کے پاس آئی ہے۔'' صوفی نے نظر اٹھا کر ہارون کو دیکھا۔

''رہام اپنے شوہر کے ساتھ اب بھی یو ایس میں رہتی ہے اور اس کے جڑواں بچے ہیں، ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔'' ہارون کا انداز جتانے والا تھا۔

صوفی کو لگا اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہے۔ اگلے پل اس نے ملامت سے خود کو لتاڑا۔

"یعنی حد ہے، میں نے کیسے سوچ لیا کہ......"

"اس میں تمہارا قصور نہیں۔" ہارون نے جیسے اس کا خیال سن لیا۔ "یہ تمہاری لو آئی کیو کا کمال ہے۔" وہ ناراضی کے اظہار کے لیے پیچھے ہوئی۔

"میں حمود کے کہنے پر سیدھا یہاں پہنچا ہوں، ابھی رہام سے با......"

"آپ خود سے نہیں حمود کے مشورے پر آئے ہیں؟" اس کے اندر کی بیوی جاگی۔ ہارون نے اس کے انداز اور شکایتی لہجے کو انجوائے کیا تھا۔ اس کا تبسم دیکھ کر وہ جز بز ہوئی۔

"جب بھی تم سے کچھ کہنے یا کرنے کے لیے "بعد" پر اٹھا رکھتا ہوں وہ "بعد" آتا ہی نہیں ہے۔" وہ پھر اس کے قریب ہوا۔ "اس لیے میں ابھی اور اسی وقت......" وہ اسکی کمر میں ہاتھ ڈال ہی رہا تھا کہ صوفی پیچھے ہٹی۔

"اس وقت مجھے بہت بھوک لگی ہے۔" اس نے ایک ہاتھ پیٹ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اسے قریب آنے سے روکا۔ "فی الحال کھانے کے علاوہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگے گا۔"

"آپی!" ہال کے دروازے میں کھڑے صفوان نے جھجک کر پکارا۔ صوفی نے جھٹ دونوں ہاتھ سیدھے کیے۔

"آپ کا ناشتہ۔" وہ غریب باہر کے کھلے دروازے سے جانے کب اندر آیا تھا۔

"مجھے لگا صرف آپ ہیں اس لیے آپ کا ہی ناشتہ لایا ہوں۔" وہ ناشتے بنانے کے لوازمات کی بجائے بازار سے بنا بنایا ناشتہ لایا تھا۔

"کوئی بات نہیں ہم دونوں مل کر کر لیں گے۔" ہارون نے اس کے ہاتھ سے لفافے اور تھیلیاں لیتے ہوئے کہا۔

"بالکل نہیں مجھے بہت بھوک لگی ہے۔" اس نے ہارون کے ہاتھ سے سب تقریباً چھینا اور کچن میں چلی گئی۔

"مم......میں اور لے کر آتا ہوں۔" بیچارا صفوان واپس دوڑا۔

ذرا دیر بعد وہ ناشتہ لیے ہال میں آئی تو ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے تھے۔

✿......✿......✿

بعد کے مراحل میں سب سے مشکل کام ہنزہ کو رہام سے متعارف کرانا تھا۔ اسے اپنی ممی سے ملنا ہے، سن کر وہ

الجھ گئی تھی۔ یہاں حمود نے اپنے طریقے سے اسے سمجھایا کہ کسی کہانی کی طرح ان کی ممی بھی ان سے بچھڑ گئی تھیں اور بڑی تلاش کے بعد اب انہیں ڈھونڈا ہے۔

"تو پاپا نے انہیں کیوں نہیں ڈھونڈا؟"

"وہ بھی ڈھونڈ رہے تھے۔"

"مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"پہلے سے بتایا ہوتا تو آپ پریشان ہوتی اسی لئے ملنے کے بعد بتایا ہے۔"

"اتنے دن تک وہ کہاں تھیں؟"

"یو ایس میں ہمیں ڈھونڈ رہی تھیں۔"

"وہ مل گئی ہیں تو کیا اب مما چلی جائیں گی؟" اس کا سب سے بڑا ڈر زبان پر آیا تھا۔

"نہیں، ممی یو ایس میں رہیں گی اور صوفی یہاں۔"

اسی قسم کے سوالوں کے بعد آخر وہ مان گئی تھی لیکن سبھی جانتے تھے کہ یہ وقتی ہے۔ کچھ سالوں بعد پھر اس کے سوالات کا سب کو سامنا کرنا تھا اور اس وقت اسے صحیح جوابات دینا لازمی تھا۔

رہام سے ملتے وقت اس میں حمود والی بے تکلفی اور گرمجوشی مفقود تھی۔ رہام کو اس کا اپنے ساتھ مہمانوں والا برتاؤ تکلیف دے رہا تھا لیکن وہ شکایت یا باز پرس کا حق کھو چکی تھی۔ اپنی حیثیت باور کرانے کا اختیار بھی نہیں رہا تھا اب اس کے پاس۔ ہنزر کو رہام اور اس کی گود یاد نہ تھی۔ وہ صوفی کے آغوش سے مانوس تھی۔ فی الحال ماں کا مقام اس نے صوفی کو دے رکھا تھا۔ آگے حالات کیا ہوں گے، کوئی نہیں جانتا تھا۔

یہ طے ہوا تھا کہ اسکول کی ہر چھٹی وہ رہام کے ساتھ گزاریں گے۔

فاطمہ آپا کو بھی اس کی طرح غلط فہمی ہوئی تھی کہ وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر آئی ہے۔ حمود اور ہنزر سے ملنے کی خواہش کو انہوں نے اس کا پچھتاوا اور دوبارہ ہارون کا ساتھ پانے کی کوشش سمجھا تھا۔

اب بھی انہوں نے صوفی کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ نند اور بھاوج کی روایتی سرد جنگ جاری تھی۔ ہارون نے صوفی سے شادی اس لیے کی تھی کہ وہ اپنے محسن کی مدد کرنا چاہتا تھا، یہ اس کی احسان مندی کا اظہار تھا اور وہ

اب بھی خود کو عبدالحمید سر کا قرض دار اور احسان مند مانتا تھا کہ انہوں نے اسے صوفی عطا کی تھی۔

”یہ قرض اور احسان چھوڑیں، مجھے تو پہلے ہی پتہ تھا کہ آپ لکی ترین انسان ہیں اور دیکھ لیں اسی لیے میں ملی ہوں آپ کو۔“ اس کی اس بات پر صوفی نے کہا تھا۔

”لکی ترین کا تو علم نہیں لیکن تمہارے ساتھ ہی خوش نصیبی بھی میرے گھر آئی تھی شاید، ورنہ تو رہام اور حمود میرے ساتھ، میرے روبرو تھے اور میں انہیں جان نہیں سکا تھا۔ شکر ہے میں نے تمہیں نظر انداز کرنے کی غلطی نہیں کی۔“

ہارون نے اسے عمر بھر اترانے کی وجہ دے دی تھی۔

حمود چھٹیوں میں رہام کے پاس گیا تھا۔ ہنر نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔

”واؤ! کتنے لمبے ہو گئے ہیں میرے بال۔“ اس نے اپنی دونوں چوٹیاں پکڑ کر آئینہ میں دیکھ کر اپنے بالوں کو سراہا۔

”پاپا دیکھیں ناں۔“ اس نے وہیں بیڈ پر لیپ ٹاپ میں مشغول ہارون کو پکارا۔

”ہم، گڈ۔“ اس نے اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی اور دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”چلو ہم باہر چلتے ہیں۔“

صوفی نے جو پلنگ پر بیٹھ کر ہی اس کے بال بنا رہی تھی، اٹھ کر برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”پاپا بزی ہیں بہت۔“

”مما!“ ہنر کی پرسوچ آواز ابھری۔

”جی۔“

”آپ پاپا کا نام کیوں نہیں لیتی ہیں؟“

صوفی ایک بار پھر اس کے کڑے مشاہدے پر حیران رہ گئی۔

”میرے سب فرینڈز کی مماان کے پاپا کو نام سے بلاتی ہیں۔“ وہ لاکھ کوشش کے باوجود ابھی تک اس کا نام

لے کر نہیں پکارتی یا بلاتی تھی۔

''بزرگوں کو نام سے بلانا بیڈ مینرز ہوتا ہے۔'' صوفی نے شرارت سے ہارون کی کنپٹی پر نظر آرہے گرے بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ہارون نے عینک کے اوپر سے اسے گھورا۔

''کیا؟'' ہمنز کو خاک سمجھا۔ تبھی ہارون کے فون پر ویڈیو کال آنے لگی۔

''بھائی ہیں۔'' ہمنز نے فوراً فون اٹھایا اور ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی جہاں سگنل زیادہ مضبوط ہوتا تھا۔ ہارون نے لیپ ٹاپ بند کیا اور چشمہ اتار کر رکھا۔ صوفی بھی ہمنز کے پیچھے جانے لگی تھی کہ ہارون نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا، وہ بیڈ پر چت گری تھی۔

''کیا کہا تم نے ابھی۔'' ہارون نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر سر سے اوپر رکھ کر اسے جیسے قید کیا اور اس پر جھکا۔

''بزرگ ہم......''

......ختم شد......